تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

اپریل ۲۰۲۲ء

شمارہ ۵

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

جلد ۲

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

ليتفقهوا في الدين

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
اقبال

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلی

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسی بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا	حفیظؔ جالندھری	۴
اداریہ	اے خیر کے طالب...	مدیر	۶
درسِ قرآن	ماہِ صیام میں قیام اللیل کی اہمیت و فضیلت	مولانا محمد اقبال	۱۰
درسِ حدیث	رمضان المبارک کی برکتیں	ابنِ عباس	۱۵
مقالات	حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۳)	مولانا نایاب حسن قاسمی	۱۷
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۰)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۲۳
مقالات	سفرنامۂ ترکی (۳)	مولانا حماد احمد ترک	۳۱
مقالات	امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۲)	محمد عثمان خان	۳۸
یسئلونک	منکرینِ حدیث	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۵
ادبیات	نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار (۱)	سلیمؔ احمد	۴۶
ادبیات	نظم: قرآن کی فریاد	ماہرؔ القادری	۵۱

حفیظؔ جالندھری (۱۹۰۰ـ۱۹۸۲ء)

معروف شاعر

غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا

غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا
یتیموں کے سروں پر کر دیا اقبال کا سایا

گداؤں کو شہنشاہی کے قابل کر دیا جس نے
غرورِ نسل کا افسون باطل کر دیا جس نے

وہ جس نے تخت اوندھے کر دیے شاہانِ جابر کے
بڑھائے مرتبے دنیا میں ہر انسانِ صابر کے

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے، زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں، موٴذِن کی اذانوں میں

وہ جس کے معجزے نے نظمِ ہستی کو سنوارا ہے
جو بے یاروں کا یارا، بے سہاروں کا سہارا ہے

وہ نورِ لَم یزل جو باعثِ تخلیقِ عالم ہے
خدا کے بعد جس کا اِسمِ اعظم؛ اِسمِ اعظم ہے

ثنا خواں جس کا قرآں ہے، ثنا ہے جس کی قرآں میں
اُسی پر میرا ایماں ہے، وہی ہے میرے ایماں میں

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

*****

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

اے خیر کے طالب...

ابتداے رمضان آواز لگوائی جاتی ہے: ’’اے طالبِ خیر! آگے بڑھ، اور اے طالبِ شر! پیچھے ہٹ‘‘۔ تو رمضان میں کرنے کے بس دو ہی کام ہیں، خیر اور نیکی میں آگے بڑھنا اور شر اور برائی سے پہلو بچانا! نیکی میں جلدی کرنا اور نیکی میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا عام حالات میں بھی پسندیدہ ہے لیکن رمضان کے ذیل میں رسول اللہ ﷺ نے بطورِ خاص اس کا ذکر فرمایا: ’’پس اللہ تمھارے تنافس (نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش) کو دیکھتا ہے اور فرشتوں پر تمھارے ذریعے فخر جتلاتا ہے۔ پس اللہ کو اپنی طرف سے نیکی دکھاؤ‘‘۔ (مسند الشامیین)

دورانِ رمضان نفل کا اجر و ثواب فرض اور ایک فرض کا اجر و ثواب ستر فرض کے برابر دیا جاتا ہے۔ لہذا، نیکی میں محنت کا اصل میدان عباداتِ اربعہ کے فرائض اور سنن و نوافل ہیں۔ اولین فرض تو نمازِ پنجگانہ ہے۔ رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق آداب و شرائط کے ساتھ ان کی پابندی کرنے والے کے ساتھ مغفرت و بخشش کا وعدہ ہے اور ایسا نہ کرنے والے کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں ہے۔ رمضان میں کوشش کی جائے کہ اچھی طرح سے وضو کرکے، تعدیلِ ارکان و آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ، مرد مسجد میں باجماعت اور خواتین گھر کے اندرونی حصے میں بر وقت نماز ادا کریں۔ فرض اور واجب نمازوں کے بعد، رمضان کا خصوصی وظیفہ نمازِ تراویح ہے جس میں رب کے حضور کھڑے ہو کر اس کا کلام سنا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایمان و اخلاص کی پابندی پر سابقہ گناہوں کی مغفرت کی نوید سنائی ہے‘‘۔ (صحیح بخاری) نمازِ تراویح کے ساتھ نمازِ تہجد کا اہتمام بھی کرنا چاہیے چاہے اتنی دیر جتنی دیر میں دو رکعت نماز پڑھی جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس

کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ”رات کی نماز نہ چھوڑنا چاہے بکری کا دودھ نکالنے کی دیر ہی کیوں نہ پڑھو“(المعجم الأوسط)۔ رمضان میں بالخصوص یہ کوشش کرنی چاہیے کہ نمازوں کے ساتھ متّصل سننِ موکدہ اور غیر موکدہ اور نمازوں سے متّصل نوافل نہ چھوٹنے پائیں۔ اس کے علاوہ تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد، صلاۃ اوابین، نماز اشراق، نماز چاشت اور صلاۃ تسبیح کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔

زکاۃ

یہ مالی عبادت صاحبِ نصاب پر فرض ہے۔ اگرچہ رمضان میں زکاۃ کی ادائی ضروری تو نہیں لیکن اگر رمضان میں زکاۃ ادا کر دی جائے تو اس کا اجر و ثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح صدقۂ فطر، ایک واجب مالی عبادت ہے۔ نمازِ عید سے پہلے پہلے اس کی ادائی لازم ہے۔ لیکن بہتر ہے کہ اس سے بھی پہلے کر دی جائے تاکہ مساکین عید کی تیاری کر سکیں۔ رمضان میں آپ ﷺ کی سخاوت عروج پر ہوتی اور آپ ﷺ لوگوں کو خیر پہنچانے میں چلتی ہوا سے زیادہ تیز ہو جایا کرتے تھے،،(بخاری)۔ ایک روایت میں رمضان میں صدقے کو افضل قرار دیا گیا ہے۔(سننِ ترمذی) رمضان میں سخاوت کی ایک صورت افطار کی ضیافت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے کسی روزے دار کو اِفطار کرایا تو اس کے لیے روزے دار کے اجر کے برابر اجر ہے بغیر اس کے کہ (افطار کرنے والے) روزے دارے کے اجر میں سے کمی کی جائے“۔ (سننِ ترمذی) اسلاف کی خدمتِ روزے دار کے انداز مختلف تھے۔ بعض اوقات لوگوں کو دعوتِ افطار پر بلاتے، بعض افطار کا سامان بھجوا دیتے، بعض حضرات مسجد میں افطار کا سامان رکھوا دیتے۔ بعض اِفطار کے ساتھ کپڑے کا جوڑا بھی پیش کرتے۔ صدقہ و خیرات اور افطار میں جہاں پڑوسی اور رشتے داروں کا خیال رکھنا ضروری ہے وہاں آفت زدہ اور مظلوم مسلمانوں کے ساتھ بھی اس اس ضمن میں تعاون کرنا چاہیے۔

حج

فرائض میں سے ایک اہم فرض حج ہے۔ اگرچہ حج بعد از رمضان، اپنے مخصوص دنوں ہی میں ادا کیا جاتا ہے۔ یہاں ذکر کرنے کا مفاد یہ ہے کہ اگر کسی پر حج فرض تھا اور اب تک وہ نہیں کر سکا تو اسے چاہیے کہ رمضان کی ساعتوں میں اب تک

کی کوتاہی پر توبہ واستغفار کر کے پہلی فرصت میں فریضۂ حج کی ادائی کی نیت وارادہ کرلے۔ رمضان میں عمرے کا اجر وثواب حج کے برابر ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے“۔ (سننِ ترمذی) پس اگر حالات اجازت دیتے ہوں تو رمضان میں عمرہ کرلینا چاہیے لیکن اس سے حج کی فرضیت ساقط نہ ہوگی۔

روزہ

فرائض میں سے ایک اہم ترین جس کا موقع ہمیں اس وقت میسر ہے وہ رمضان کے روزے رکھنا ہے۔ اس فرض کو ہر حال میں ادا کیا جائے۔ بعض حضرات کسی ایسے عذر کی بنا پر روزہ چھوڑ دیتے ہیں جس کا شریعت نے لحاظ نہیں کیا مثلاً سالانہ امتحانات یا دس، بیس کلو میٹر کا سفر وغیرہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح کے عذرِ لنگ پر روزہ ترک کرنے سے انسان گناہ گار ہوتا ہے۔ اگرچہ بعد میں ایک دن کی قضا تو کرنا پڑے گی لیکن اس سے رمضان میں ملنے والے اجر کے برابر ملنا ناممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ” جس نے کسی شرعی رخصت کے بغیر رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑ دیا تو ہمیشہ روزہ رکھنا بھی (اجر میں) اس ایک دن کے برابر نہیں ہوسکتا“۔ (سننِ ابنِ ماجہ) ماہِ رمضان میں ظاہر ہے کہ نفل روزے رکھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن رمضان کے بعد نفلی روزے رکھنے کی نیت ابھی سے کرلینی چاہیے۔

تلاوتِ قرآن اور ذکر ومناجات

رمضان چونکہ قرآن کا مہینا ہے اور اس میں دیگر اعمال کی طرح تلاوت کا اجر وثواب بھی زیادہ کر دیا جاتا ہے تو رمضان میں بکثرت تلاوت کرنی چاہیے۔ سَلَفِ صالحین رمضان میں تلاوتِ قرآن پر خاص توجہ دیتے تھے۔ بعض؛ مہینے میں تین دور مکمل کرتے، بعض؛ مہینے میں ساٹھ دور مکمل کرتے اور بعض؛ تیس دور مکمل کرتے۔ ہم ان بزرگوں تک تو نہیں پہنچ سکتے لیکن بساط بھر زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت کرنی چاہیے۔ درود شریف کی احادیث میں بہت فضیلت آئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو مجھ پر درود پڑھنا بھول گیا وہ جنت کے راستے سے بھٹک گیا“۔ (سنن ابنِ ماجہ) صبح وشام دس بار درود پڑھنے کو رمضان اور غیر رمضان میں معمول بنانا چاہیے کہ اس سے شفاعتِ رسول ﷺ کی امید ہے: ”جو مجھ پر دس بار صبح اور دس بار شام درود پڑھے گا، قیامت والے دن اسے میری شفاعت حاصل ہوگی“۔ (مجمع الزوائد) اسی طرح

رمضان میں ذکر کا اہتمام کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: روزے داروں میں زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: ''ان میں سے اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والا''۔(مسندِ احمد) کوشش کرنی چاہیے کہ نمازِ فجر کے بعد سے نمازِ اشراق تک بیٹھ کر یا چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کیا جائے۔ اسی طرح نمازِ عصر کے بعد سے نمازِ مغرب تک کا وقت یا اس کا کوئی ایک حصہ ذکر کے لیے مخصوص کیا جائے۔ اس لیے کہ ان اوقات میں ذکر کرنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ چلتے پھرتے بھی ذکر کرنے کی کوشش کی جائے۔ رمضانِ کریم میں کثرت سے دعا کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ احادیث کے مطابق حالتِ روزہ میں بوقتِ افطار، روزے دار کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے: ''روزے دار کی دعا رد نہیں کی جاتی''۔(مسندِ احمد)

اجتنابِ شر

اب ہم دوبارہ ندائے رمضانی کی طرف آتے ہیں۔ تو دوسری ندا یہ تھی کہ ''اے برائی کے چاہنے والے! پیچھے ہٹ''۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''روزہ ڈھال ہے جب تک تم اسے توڑ نہ دو''۔(سننِ دارمی) توڑنے سے مراد یہی ہے کہ روزے کے منافی کوئی قول و فعل نہ کیا جائے۔ حدیث میں آتا ہے: ''کتنے ہی روزے داروں کو بھوک کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔(سننِ ابنِ ماجہ) امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ یا تو وہ ہیں جو حرام روزی سے روزہ افطار کرتے ہیں یا پھر غیبت وغیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یا پھر وہ لوگ ہیں جو اپنے اعضا و جوارح کو حرام کاری سے نہیں بچاتے۔ رمضان کا اہم وظیفہ حرام اشیا اور حرام افعال سے بچنا ہے۔ حرام کمائی، جوا، سٹہ، لاٹری، رشوت یا سودی معاملے میں ملوث ہونا، کسی سے قرض یا ادھار لے کر ہڑپ کر جانا، ناچ گانا اور فحاشی عریانی کے مناظر دیکھنا، گالم گلوچ کرنا، چغلی یا غیبت میں مشغول رہنا، یہ وہ تمام امور ہیں جن کے ارتکاب سے روزہ ناقص ہو جاتا ہے''۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو جھوٹی بات اور غلط کام کرنا نہ چھوڑے اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا پیاسا رہے''۔(صحیح بخاری)

* * * *

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

ماہِ صیام میں قیام اللیل کی اہمیت و فضیلت

﴿وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ أَصِيلًا وَ مِنَ الَّيلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيلًا طَوِيلًا﴾(سورۃ الدہر:۲۶،۲۵)

”اور اپنے پروردگار کے نام کا صبح وشام ذکر کیا کرو۔ اور کچھ رات کو بھی اس کے آگے سجدے کیا کرو، اور رات کے لمبے وقت میں اس کی تسبیح کرو“۔

آیاتِ مبارکہ کی تفسیر

آیاتِ مذکورہ کی تفسیر میں علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَ اذكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ أي صلِّ لربك، ”اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کیا کرو“ یعنی اپنے پروردگار کی رضا کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ ﴿بُكرَةً وَّ أَصِيلًا﴾ وأكثر من عبادته وطاعته أي في أول النهار وآخره، في الصباح والمساء، ”صبح اور شام کو“ یعنی اپنی عبادات میں دن کے آغاز اور اختتام میں اضافہ کرو۔ ﴿وَ مِنَ الَّيلِ فَاسجُد لَه﴾ أي ومن الليل فصلِّ له، متهجداً مستغرقاً في مناجاته، ”اور کچھ رات کو بھی اس کے آگے سجدے کیا کرو“ یعنی رات کے ایک حصے میں نماز کا اہتمام کرو اور اپنی دعا و مناجات میں مشغول رہا کرو۔ ﴿وَ سَبِّحهُ لَيلًا طَوِيلًا﴾ أي وأكثر من التهجد والقيام لربك في جناح الظلام والناس نيام، ”اور رات کے لمبے وقت میں اس کی تسبیح کرو“ یعنی رات کے اندھیرے میں اس وقت تہجد کی نمازیں کھڑے ہو جبکہ لوگ سو رہے ہوں۔ (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَ اذکُرِ اسمَ رَبِّکَ بُکرَۃً وَّ أَصِیلًا ﴾ ”اور اپنے پروردگار کے نام کا صبح وشام ذکر کیا کرو“ ۔یعنی دن کے آغاز اور اختتام میں۔ پس ان اوقات میں فرض نمازیں اور سنتیں، ذکر، تسبیح، تہلیل اور تکبیر سب داخل ہیں۔ (تفسیرِ سعدی)

﴿وَ اذکُرِ اسمَ رَبِّکَ بُکرَۃً وَّ أَصِیلًا ﴾ ”اور اپنے پروردگار کے نام کا صبح وشام ذکر کیا کرو“ ۔یعنی آپ اپنی شان اور طاقت کے مطابق دعوت الی اللہ اور ذکر اللہ کی طرف بشمول تمام انواع واقسام کے متوجہ رہا کیجیے۔ اور اس میں رہنمائی ہے اس بات کی طرف جس میں لوگوں کی باتوں پر صبر کرنے سے مدد ملتی ہے۔ اور ”البکرۃ“ اور ”الأصیل“ سے مراد دن کے تمام اوقات ہیں، یعنی ان کا اعراض تمھیں روک نہ دے حق کی طرف بار بار دعوت سے دن کے شروع کے حصے میں اور آخر کے حصے میں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں تمام نمازیں داخل ہیں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَ أَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیلِ إِنَّ الحَسَنٰتِ یُذهِبنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِکَ ذِکرٰی لِلذّٰکِرِینَ وَ اصبِر فَإِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیعُ أَجرَ المُحسِنِینَ ﴾ (۱۱۴۔۱۱۵) ”اور (اے پیغمبر) دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔ یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ایک نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت مانیں۔ اور صبر سے کام لو، اس لیے کہ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا“ ۔ (تفسیرِ ابنِ عاشور)

”پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انھیں کی اس عمل کی طرف رہنمائی فرمائی جو صبر و ثبات کے واسطے معاون ہے۔ پس فرمایا: ﴿وَ اذکُرِ اسمَ رَبِّکَ بُکرَۃً وَّ أَصِیلًا ،وَ مِنَ الَّیلِ فَاسجُد لَه وَ سَبِّحهُ لَیلًا طَوِیلًا ﴾ البکرۃ: دن کا ابتدائی حصہ، و الأصیل: دن کا آخری حصہ، اس سے مراد ہر ہر گھڑی میں اللہ کی یاد پر مداومت اختیار کرنا ہے۔ یعنی اے نبیٔ مکرم! آپ ہمیشگی اختیار کریں دن کے ابتدائی حصے میں اور آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر پر، اسی طرح فجر، ظہر اور عصر کی نماز پر مداومت وتسلسل کے ساتھ قائم رہا کیجیے“ ۔ (تفسیر الوسیط)

مادیت کے اس دور میں جب انسانی زندگی مادی آلائشوں سے آلودہ ہو چکی ہے، باطن کی دنیا حرص وہوس اور خواہشاتِ نفسانی کی اسیر ہو چکی ہے، مجموعی حیثیت سے انسانی روحیں بیمار ہیں، ایسے میں بیمار روحوں کو شفایاب ہونے، باطن کو نورِ ایمان

سے منور کرنے کا واحد علاج یادِ الٰہی ہے۔ آیاتِ مذکورہ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ صبح و شام اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔

رمضان المبارک میں قیام اللیل کا اہتمام

ویسے ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور کے سامنے اپنی عاجزی کے اظہار کا ہر وقت استحضار ہونا چاہیے مگر رمضان المبارک کا مہینا اللہ تبارک و تعالیٰ کی یاد اور اپنے نفس کے خلاف جہاد کے لیے ایک بہترین موقع ہے۔ یہ مبارک مہینا صبر و تحمل کا مہینا ہے۔ یہ نفسِ انسانی پر غیر معمولی اثرات ڈالتا ہے۔ اس میں دنیوی تحریصات و ترغیبات کے مقابلے میں قوت و طاقت میں بے انتہا اضافہ ہوتا ہے۔ اس مہینے میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں۔ رمضان خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے۔ ماہِ صیام میں ذکر و اذکار اور تلاوتِ کلامِ پاک کی کثرت ہونی چاہیے۔ دن کے اوقات میں روزہ جبکہ رات میں قیام یعنی تراویح میں قرآن کی تلاوت کا سماع ہونا چاہیے۔ احادیث میں اس کی کثرت سے ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، قَالَ: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» (صحیح مسلم) ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی نے ایمان اور ثواب کی نیت سے رمضان کی رات کو قیام کیا تو اس کے سارے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے“۔

قیامِ رمضان یعنی تراویح کے آغاز کے متعلق اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”رسول اللہ ﷺ رات کے درمیانی حصے میں نکلے، آپ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی تو کچھ آدمیوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو صبح لوگ اس کا تذکرہ کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ دوسری رات نکلے تو پہلی رات سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے اور انھوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، لوگوں نے صبح کو اس بات کا ذکر کیا۔ تیسری رات میں مسجد والے بہت زیادہ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ باہر نکلے، لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر جب چوتھی رات ہوئی تو مسجد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھر گئی تو آپ ﷺ مسجد والوں کی طرف نہ نکلے، مسجد والوں میں سے بعض حضرات نے الجماعۃ الجماعۃ کی ندائیں بلند کیں!

رسول اللہ ﷺ پھر بھی ان کے پاس تشریف نہ لائے، یہاں تک کہ آپ ﷺ فجر کی نماز کے لیے نکلے تو جب فجر کی نماز ادا کی گئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف آپ ﷺ متوجہ ہوئے، پھر تشہد پڑھا اور فرمایا: اما بعد! تمھاری آج کی رات کی حالت مجھ سے چھپی ہوئی نہ تھی لیکن مجھے ڈر لگا کہ کہیں تم پر قیامِ رمضان یعنی تراویح فرض نہ کر دی جائے پھر تم اس کے پڑھنے سے عاجز آجاؤ"۔ (صحیح مسلم) جبکہ اس روایت کو نقل کر کے امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول نقل فرمایا: "حالانکہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں قیام کی ترغیب دیا کرتے تھے سوائے اس کے کہ اس پر زور نہ دیتے تھے۔ پس ترغیب کے طور پر فرماتے تھے: "جو آدمی رمضان میں ایمان اور ثواب سمجھ کر قیام کرے تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"۔ رسول اللہ ﷺ وصال فرما گئے اور آپ ﷺ کا یہ حکم اسی طرح باقی رہا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں اسی طرح یہ حکم باقی رہا، یہاں تک کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت پر لوگوں کو جمع کیا اور وہ اُن کو تراویح پڑھاتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باقاعدہ جماعت کے ساتھ رمضان المبارک میں تراویح پڑھنے کے لیے اکھٹے ہوئے"۔ اسی طرح امام زید بن علی رحمہ اللہ نے اپنے آباواجداد کی سند سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ حکم روایت کیا ہے: عَنْ عَلِيٍّ رضي الله عنه أَنَّه أَمَرَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ صَلَاةَ الْقِيَامِ فِيْ شَهْرِ رَمْضَانَ أَنْ يُّصَلِّيَ بِهِمْ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً، يُّسَلِّمُ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُرَاوِحَ مَابَيْنَ كُلِّ أَرْبَعِ رَكْعَاتٍ۔ (مسندالإمام زیدبن علی) "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو حکم دیا جو لوگوں کو رمضان المبارک کے مہینے میں نمازِ تراویح پڑھاتے تھے کہ وہ ان کو بیس رکعات نماز پڑھائیں۔ ہر دو رکعتوں کے درمیان سلام پھیرے اور ہر چار رکعتوں کے درمیان آرام کے لیے کچھ دیر وقفہ کرے"۔ لہٰذا تراویح کی نماز سنتِ مؤکدہ ہے۔ خلفاے راشدین، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین اور سلَفِ صالحین رضی اللہ عنہم اجمعین سے پابندی سے تراویح پڑھنا ثابت ہے۔ حضور ﷺ نے تین دن تراویح کی جماعت قائم فرمائی تھی لیکن اس اندیشے سے تراویحِ باجماعت کا مستقل اہتمام نہیں فرمایا کہ کہیں فرض نہ ہوجائے۔ مگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انفرادی طور پر یا کبھی دو دو چار چار مل کر جماعت کے ساتھ تراویح پڑھ لیتے تھے۔ یہ سلسلہ امیر

المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے اوائل تک برقرار رہا پھر آپ رضی اللہ عنہ نے باضابطہ جماعت کے ساتھ تراویح کا مستقل نظم بنایا جو آج تک قائم ہے۔ یہی سنت ہے، اسی پر اجماعِ امت ہے اور اسی پر چاروں فقہی مذاہب کا فتویٰ اور عمل ہے۔ یہ ایک متوارث و متواتر عمل ہے، صدرِ اول سے آج تک امت بیس رکعت تراویح کی قائل ہے اور چودہ سو سال سے حرمین شریفین اور مسجدِ اقصیٰ میں بیس رکعت ہی پڑھی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ حضرات جو رمضان المبارک میں نفسِ نمازِ تراویح یا بیس رکعات یا باجماعت تراویح کے قائل نہیں ہیں، ان کا موقف درست نہیں ہے، جبکہ ان کے لیے مذکورہ دلائل کافی ہونے چاہییں۔ اللہ تعالیٰ آنے والے ماہِ صیام میں ہمیں اپنے اوقات کو اپنے پروردگار کی یاد میں بسر کرنے اور کثرتِ تلاوتِ کلامِ پاک اور قیام اللیل کی توفیق عطا فرمائیں۔

* * * * *

صدقۃ الفطر

صدقۃ الفطر سال میں ایک بار لازم ہوتا ہے جو ہر صاحب نصاب پر اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے دینا لازم ہوتا ہے اور اس کی مقدار پونے دو سیر گندم یا ساڑھے تین سیر جو، کھجور یا کشمش ہے، ان چار اشیا میں سے کسی ایک کی قیمت بھی حسب استطاعت ادا کی جا سکتی ہے۔ (بحوالہ: فتاویٰ ہندیہ، کتاب الزکوٰۃ، الباب الثامن فی صدقۃ الفطر)

ابنِ عباس
معاون قلم کار

رمضان المبارک کی برکتیں

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أُعْطِيَتْ أُمَّتِي خَمْسَ خِصَالٍ فِي رَمَضَانَ، لَمْ تُعْطَهَا أُمَّةٌ قَبْلَهُمْ: خُلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ وَتَسْتَغْفِرُ لَهُمُ الْمَلَائِكَةُ حَتَّى يُفْطِرُوا وَيُزَيِّنُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ كُلَّ يَوْمٍ جَنَّتَهُ ثُمَّ يَقُولُ يُوشِكُ عِبَادِي الصَّالِحُونَ أَنْ يُلْقُوا عَنْهُمُ الْمَئُونَةَ وَالْأَذَى وَيَصِيرُوا إِلَيْكِ وَيُصَفَّدُ فِيهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِينِ فَلَا يَخْلُصُوا فِيهِ إِلَى مَا كَانُوا يَخْلُصُونَ إِلَيْهِ فِي غَيْرِهِ وَيُغْفَرُ لَهُمْ فِي آخِرِ لَيْلَةٍ» قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَهِيَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ؟ قَالَ: «لَا وَلَكِنَّ الْعَامِلَ إِنَّمَا يُوَفَّى أَجْرَهُ إِذَا قَضَى عَمَلَهُ» (مسند احمد)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کو رمضان کے متعلق پانچ چیزیں دی گئیں جو پہلے کسی امت کو نہیں دی گئی تھیں۔ ہمارے روزے دار کے منھ کی باس اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ فرشتے ان کے لیے دعاے مغفرت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ روزہ افطار کرلیں۔ اللہ تعالیٰ روزانہ جنت کو سجاتے ہیں اور اس سے فرماتے ہیں قریب ہے کہ میرے بندے مشقت و کُلفت کا شکار ہو کر تیری طرف (آرام پانے) آئیں۔ اور اس مہینے میں سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے اور وہ (گمراہی پھیلانے میں) اتنی بھاگ دوڑ نہیں کرسکتے جتنی دوسرے مہینوں میں کرتے ہیں۔ رمضان کی آخری رات میں میرے امتیوں کو بخش دیا جاتا ہے۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ! کیا یہی لیلۃ القدر ہے؟ فرمایا: نہیں، لیکن (مغفرت اس اصول کے تحت کی جاتی ہے کہ) جب مزدور اپنا کام مکمل کرتا ہے تو اسے اس کا اجر دے دیا جاتا ہے“۔

فائدہ

باس سے مراد وہ بو ہے جو بھوکا پیاسا رہنے سے منہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بدبو مراد نہیں ہے جو دانت صاف نہ کرنے سے پیدا ہو جائے۔ فرشتے روزے دار کے لیے دعا کرتے ہیں اس میں اشارہ ہے کہ روزے دار کی اپنی دعا بھی قبول ہو تی ہے جیسا کہ دوسری روایات میں صراحت سے ذکر ملتا ہے لہذا دورانِ روزہ دعا کرتے رہنا چاہیے۔ روزے میں جب بھی مشقت لاحق ہو تو سوچ لینا چاہیے کہ جنت میں ہماری مہمان نوازی کا انتظام ہو رہا ہے۔ ماہِ رمضان میں شیطانوں کی گمراہ کرنے کی صلاحیت میں کمی آتی ہے لہذا چاہیے کہ عبادت میں محنت کی جائے۔ رمضان کی آخری رات، چاہے وہ جفت ہو یا طاق، مغفرت کی رات ہے اور مغفرت کی وجہ وظیفۂ رمضان کی تکمیل ہے، لہذا مغفرت کی رات میں مغفرت طلب کرنا اور مغفرت کے لائق امور یعنی عبادت و ذکر و اذکار بجالانا، اللہ کی مغفرت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمانوں کے لیے رمضان سے بہتر مہینا کوئی نہیں ہے اور منافقوں پر رمضان سے برا مہینا کوئی نہیں ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ مسلمان اس میں عبادت کے لیے قوت پاتے ہیں جبکہ منافقین لوگوں کی پوشیدہ غلطیوں کوتاہیوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ یہ مہینا مومن کے لیے غنیمت ہے جبکہ فاجر و فاسق شخص اسے ضائع کرتا ہے“۔ (مسند احمد)

حدیث میں رمضان کے بہترین ہونے کی وجہ بیان کی گئی اور وہ عبادت میں محنت اور اس کے لیے اوقات کو فارغ کرنا ہے۔ لہذا ماہِ رمضان میں زیادہ سے زیادہ امورِ عبادت میں مشغول رہنا چاہیے۔ منافقین سے حقیقی یعنی اعتقادی منافق بھی مراد ہو سکتے ہیں لیکن امکان یہ بھی ہے کہ اس سے مراد عملی منافق یعنی بعض منافقانہ اعمال میں ملوث، فاسق و فاجر مسلمان ہوں۔ دونوں صورتوں میں حدیث کا مفاد یہ ہے کہ غیبت اور عیب جوئی منافقانہ اعمال ہیں اور روزے کے اجر و ثواب کو ضائع کرتے ہیں۔ اس لیے عام زندگی میں بھی اور بالخصوص رمضان میں لوگوں کے برے ذکر سے سختی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

****

مولانا نایاب حسن قاسمی
رکن شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۳)

مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا ایک جامع تعارف

مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت

یہ کتاب دراصل ایک مکتوب ہے، جو آپ نے دارالعلوم دیوبند کے ایک ایسے فاضل کو لکھا تھا، جو جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہو گئے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ جمہورِ امت اور جماعتِ اسلامی کا اختلاف محض فروعی ہے، اصولی نہیں ہے، اس مکتوب کو مکتبۂ دارالعلوم نے خوبصورت کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے، اس کے شروع میں حکیمُ الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا بصیرت افروز اور فصیح و بلیغ مقدمہ ہے، جس میں آپ نے مشہور حدیث شریف «لَتَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ عَلٰى ثَلٰثٍ وَّسَبْعِيْنَ فِرْقَةً» الخ کی روشنی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے معیارِ حق ہونے پر انتہائی وقیع گفتگو کی ہے، آپ نے قرآن و حدیث کے استشہادات کی روشنی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت، معیاریت اور بالاتر از تنقید ہونے کو ثابت کیا ہے، اس کے بعد ۴۴ صفحے میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر ہے، جس میں آپ نے انتہائی سلجھے ہوئے اور سنجیدہ اسلوب میں جماعتِ اسلامی کے دستور کی دفعہ نمبر ۶: ”رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں نہ مبتلا ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو، اس کو اسی درجے میں رکھے“ کا علمی، منطقی و تحقیقی تجزیہ کرتے ہوئے اس کو ماننے کی صورت میں اس پر مرتب ہونے والے خطرناک عواقب و نتائج پر سیر حاصل بحث کی ہے، آپ نے

اعاظمِ رجالِ حدیث اور امام ابوزرعہ رازی، حافظ ابنِ عبدالبر، حافظ ابنِ حجر عسقلانی، علامہ ابنِ ہُمام اور ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہم کے حوالے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تئیں اہل السنۃ والجماعۃ کے متفق علیہ و معتبر عقیدے کو واضح کیا ہے اور اس ذیل میں آپ نے مولانا مودودی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ان فکری لغزیدہ پائیوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں، جو ان سے ان کی مشہور کتاب ''تفہیمات'' میں سرزد ہوئی ہیں، اس کے بعد قرآنِ کریم کی ایسی نو آیتوں کو بطورِ استشہاد پیش کیا ہے، جن میں صراحتاً تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعدیل، توثیق اور ان کے فضائلِ عالیہ کا ذکر ہے، پھر بارہ ایسی صریح حدیثیں بیان کی ہیں، جن میں آپ نے انفراداً یا اجتماعاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ستائش کی ہے، اپنے بعد انھیں واجب الاتباع بتلایا ہے اور ان نقوشِ پا کو مشعلِ راہ بنانے کی تلقین کی ہے... بلاشبہہ یہ کتاب صحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالے سے مبنی برحق عقیدہ رکھنے والوں کے اطمینانِ قلب کا ذریعہ اور انصاف پسند نفوس کی آنکھیں کھول دینے کا وسیلہ ہے۔

ایمان و عمل مع اعتراضات و جوابات

یہ اصل میں بیس صفحات کا ایک رسالہ تھا، جس میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کی روشنی میں یہ ثابت کیا تھا کہ وہ فرض عبادات کے تارک اور گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو قطعاً مسلمان نہیں سمجھتے اور اسے خارج از ایمان گردانتے ہیں، پھر آپ نے جمہورِ امت اور ائمۂ سلف کے اقوال و تحریرات کی روشنی میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کا جائزہ لے کر ان کی متشددانہ قلم رانیوں سے مسلمانوں کو باخبر کیا تھا، کسی صاحب نے وہ تحریر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچادی اور انھوں نے اپنے رسالہ ''ترجمان القرآن'' کے مارچ ۱۹۵۳ء کے شمارے میں مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ الزامات لگائے کہ انھوں نے میری تحریروں کے سیاق و سباق پر غور و تامل اور انصاف پسندانہ نظر ڈالے بغیر میرے بارے میں وہ رائے ظاہر کی ہے، جو انھیں نہیں کرنی چاہیے تھی، وہ تحریر آپ کی نظر سے گزری، تو آپ نے پھر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کا محاسبہ کرتے ہوئے خالص علمی و تحقیقی پیرائے میں اس عقیدے کو مبرہن و مدلل فرمایا کہ مرتکبِ کبیرہ اور تارکِ فرائضِ شرعیہ ایمان سے خارج نہیں ہے اور یہی تمام اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے، جب کہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریریں مرتکبِ کبیرہ اور تارکِ فرائضِ شرعیہ کو ایمان سے خارج کرتی ہیں،

جیساکہ خوارج اور معتزلہ وغیرہ کا عقیدہ ہے... یہ رسالہ اس کے باوجود کہ ایک عظیم الشان اختلافی موضوع پر لکھا گیا ہے (اور اسی وجہ سے اس میں جابہ جا قرآن وحدیث اور کبار مفسرین ومحدثین کے اقوال سے استدلال کیا گیا ہے) مولانا (مدنی) کا اسلوب انتہائی سنجیدہ، ناصحانہ اور بے پناہ کشش رکھنے والا ہے۔

مکتوبِ ہدایت

یہ بھی مکتبۂ دارالعلوم سے شائع شدہ ہے، یہ تحریک جماعتِ اسلامی کے کسی بڑے عالم کو لکھا گیا ایک جوابی خط ہے، اس میں آپ نے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تر تحریروں کی روشنی میں ان کے فکری انحرافات، جمہورِ امت سے ان کے سوے ظن، کج رو فِرَقِ اسلامیہ سے ان کے خیالات کے قرب، اسلام کے معتمد علیہ لٹریچر کے ایک بڑے حصے سے ان کی بدگمانی اور قرنِ اول سے لے کر بعد تک کے بہت سے محسنینِ امت پر ان کی چھینٹاکشی کی نشان دہی کی ہے، اس میں دو دیگر فتاویٰ بھی شامل ہیں، جن میں یہی باتیں مزید تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہیں، ایک مفتی مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ بہ عنوان "آئینۂ تحریکِ مودودیت" اور دوسرا مولانا مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مفتی مظاہرِ علوم، سہارن پور) بہ عنوان "کشفِ حقیقت" ہے، ان دونوں میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کے اقتباسات کی روشنی میں ان کی تحریک کی کج ادائی کو واضح کیا گیا ہے، اس مسئلۂ متعلقہ پر ایک مختصر فتویٰ مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

الشہابُ الثاقب علی المسترق الکاذب

اس کتاب میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلکِ بریلویت کے بانی مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کی ان تلبیسات کا جائزہ لیا ہے، جو انھوں نے سرکردہ علماے دیوبند کے خلاف پھیلائیں اور ہندی مسلمانوں کو ان سے بیزار کرنا چاہا تھا، اس کا اِجمال یہ ہے کہ ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں انھوں نے ان علماے دیوبند کی طرف خالص کفریہ عقائد منسوب کر کے ایک تحریر تیار کی اور اس کی روشنی میں حرمین شریفین کے علما وفقہا سے فتاویٰ حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے حجاز کا سفر

کیا، وہاں کے اکثر علمانے تو نہ صرف اس کی تصدیق کرنے سے صاف انکار کردیا؛ بلکہ ان کے فسادِ نیت اور کج فہمی و علمی نارسائی پر ان کی خوب خبر بھی لی؛ مگر بعض سادہ لوح علمانے ان کی تصدیق بھی کردی؛ چناں چہ واپسی کے بعد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دو رسالے ''تمہیدِ شیطانی'' اور ''حسام الحرمین'' کے نام سے شائع کیے اور پورے ہندوستان میں یہ ڈھنڈورا پیٹنے لگے کہ علماے حرمین نے ان دیوبندی علما کی تکفیر کی ہے اور ان کے عقائد سے براءت کا اظہار کیا ہے، یہ محض اتفاق تھا کہ فراغت کے بعد سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ منورہ ہی میں قیام پذیر تھے اور انھیں معلوم بھی ہو گیا تھا کہ مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ یہاں آئے تھے اور ان کا مقصد کیا تھا؛ چناں چہ جب وہ ہندوستان پہنچے اور دیکھا کہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا گل کھلا رہے ہیں، تو ان کے دجل و فریب کی قلعی کھولنے اور علماے دیوبند پر لگائے گئے ان کے بے سروپا الزامات کی تردید کے لیے آپ نے رسالہ لکھا، اس رسالے کے دو باب ہیں: پہلے باب میں علماے حرمین سے فتویٰ لینے میں خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکر و فریب کی تفصیلات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرا باب نو فصلوں پر مشتمل ہے، جن میں علماے دیوبند پر لگائے گئے الزامات و افتراءات پر گفتگو کی گئی ہے، پہلی فصل حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پر لگائے گئے اتہامات کے تفصیلی تذکرے کو محیط ہے، دوسری فصل میں عقیدۂ ختمِ نبوت پر کلام کیا گیا ہے، تیسری فصل میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر لگائے گئے الزامات کا بیان ہے، چوتھی فصل میں مسئلۂ امکان و امتناع کی تنقیح کی گئی ہے، پانچویں فصل میں مولانا خلیل احمد سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ پر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تہمتوں کا بیان ہے، چھٹی فصل میں مولانا سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''براہینِ قاطعہ'' کی متعلقہ عبارت کے صحیح مفہوم کی نشان دہی ہے، ساتویں فصل میں مولانا سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ پر لگائی گئی دوسری تہمت کا تذکرہ ہے، آٹھویں فصل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاوہ گوئیوں کا محاسبہ ہے اور آخری فصل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''حفظ الایمان'' کی اس عبارت کی توضیح ہے، جس کو بنیاد بنا کر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے خلاف زبان و قلم کا بے محابا استعمال کیا تھا، پوری کتاب انتہائی محقَق ہے اور اس کا لفظ لفظ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بے پناہ علم اور سِعت نگاہی کی منھ بولتی تصویر ہے۔

سلاسلِ طیبہ

علماے دیوبند شروع ہی سے نہ صرف علم وفضل کے اعتبار سے مقامِ ممتاز کے حامل رہے ہیں؛ بلکہ وہ تصوف وسلوک کے بھی امام رہے ہیں، بانیانِ دارالعلوم سے لے کر اس کے فضلا میں سے بیشتر نے اپنے اپنے وقت میں اس میدان میں بھی اپنی خاص شناخت بنائی اور جاہلانہ طریقت اور رسمی ولایت کا پرچار کرنے کی بہ جاے اس طریقت وولایت کی نمائندگی کی ہے، جس کا سرا نبی پاک ﷺ تک پہنچتا ہے، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے وقت کے باکمال صوفی اور ولیٔ کامل تھے، آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں تھی، آپ کو بیعت وخلافت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھی، "سلاسلِ طیبہ" میں آپ نے صوفیا کے چاروں طریقوں (قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی) کے اوراد واَشغال اور ان کے منظوم شجروں کو طالبین وسالکین کی آسانی ورہ نمائی کے لیے یک جا کر دیا ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک انتہائی تحقیقی مقالہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اور ان کی آمد کے بعد ہندوستان کی تعلیمی حالت پر ہے، اس میں محقَق ومستند اعداد وشمار کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اور مغلیہ دورِ حکومت میں ہندوستان کی تعلیمی حالت انتہائی بہتر؛ بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کے لیے باعثِ رشک تھی، یہاں تعلیم گاہوں کی کثرت، حُصولِ علم کے دیگر وسائل وذرائع کی بہتات اور علم وعلما کا دور دورہ تھا، خواہ دینی ومذہبی علوم ہوں یا عصری وپیشہ ورانہ علوم، ہر ایک میں یہاں کے باشندے یکہ تاز ہوا کرتے تھے؛ لیکن جب انگریزوں کے ناپاک قدم اس ملک پر پڑے، تو جہاں انھوں نے سیاسی ومعاشی اعتبار سے اس کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی شیطانی تدبیریں کیں، وہیں یہاں کے باشندوں کو فکری وعلمی طور پر اپاہج بنادینے میں بھی اس عیار ومکار قوم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی، ہوسکتا تھا کہ یہ بات بہت سے "اسکالروں" اور "دانش وروں" کو اوپری معلوم ہو؛ اس لیے آپ نے اپنی بات کو خود انگریزی مصنّفین کی تحریروں سے مدلل کیا ہے اور ان کے بیانات کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ انگریزی سامراج نے کس طرح اس ملک کا علمی وفکری استحصال کرنے کی سازشیں رچائیں؛ تاکہ ہندی قوم ذہنی وفکری اعتبار سے مفلوج ہوجائے اور ذلت واستعباد کی زندگی پر راضی ہوکر حصولِ آزادی کے شعور سے بیزار ہوجائے، یہ مقالہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۴۳ء میں تحریر کیا تھا، جب

کہ جدوجہدِ آزادی پورے شباب پر تھی، اسی زمانے میں اسے ایک رسالے کی شکل میں مجلس قاسم المعارف دیوبند نے چھاپا تھا، پھر یہ نایاب ہوگیا تھا، اتفاق سے اس کا ایک نسخہ کہیں سے معروف عربی وارد و ادیب وصحافی مولانا نورعالم خلیل امینی مُدظلہ العالی کو ہاتھ لگ گیا، انھوں نے اس کی غیر معمولی اہمیت ووقعت کو محسوس کیا اور اس کو عربی کے قالب میں ڈھال کر اولاً دارالعلوم دیوبند کے عربی مجلہ ماہ نامہ ''الداعی'' میں قسط وار شائع کیا، پھر ان کی تحریک و ترغیب پر شیخ الہند اکیڈمی نے اسے ''الحالة التعليمية في الهند قبلَ الاستعمار الانجليزي وفيما بعده'' کے نام سے بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ چھاپا ہے اور یہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند میں دست یاب ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف بکھرے ہوئے مقالات اور چند ایک تقریروں کا بھی مولانا امینی مدظلہ العالی نے ''بحوث في الدعوة والفكر الإسلامي'' کے نام سے عربی ترجمہ کیا ہے اور وہ بھی اکیڈمی سے طبع شدہ ہے۔

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۰)

خلافتِ عباسیہ اور سلطنتِ روم

عہدِ محمد بن ہارون الرشید المعتصم باللہ (۲۱۸ تا ۲۲۷ھ)

محمد المعتصم بن ہارون الرشید ابن المہدی بن المنصور العباسی یہ خلیفہ مامون کے سوتیلے بھائی تھے۔ جو خلیفہ مامون کی وصیت سے خلیفہ بنائے گئے۔ شروع کے چند سال معتصم کی توجہ آذر بائیجان کی طرف رہی جہاں، اباحیت و مزدکیت کے پرچارک بابک الخُرَّمي نے غُل مچایا ہوا تھا۔ ۲۲۲ھ میں جب خرمیوں پر فتح حاصل ہوئی اور ان کے قلعوں پر قبضہ کیا تو وہ روم کی سرحدوں میں داخل ہوگئے اور شاہِ روم کو مسلمانوں پر حملے کے لیے قائل کیا۔ چنانچہ ۲۲۲ھ میں رومیوں نے ایک لاکھ سے زیادہ تعداد کے لشکر سے مسلمانوں کے مقبوضہ رومی علاقوں میں مسلمانوں پر حملے شروع کیے اور زِبَطرہ اور مَلَطیہ کے علاقوں کو تاراج کیا اور بہت سارے مسلمانوں کو قتل اور قیدی کیا۔ اسی سانحے میں معتصم تک ایک مسلمان قیدی عورت کی خبر پہنچی تھی کہ وہ وَامُعْتَصِمَاہُ! پکار رہی تھی۔ یہ سنتے ہی خلیفہ لَبَّيْكِ لَبَّيْكِ کہتے ہوئے اپنے تخت سے اٹھے، النَّفِيرَ النَّفِيرَ کہتے جنگ کا اعلانِ عام کرتے ہوئے محل سے نکلے اور فوجوں کو تیاری کا حکم دیا۔ پھر انھوں نے بغداد کے قاضی اور دیگر معززین کو بلا کر اپنے ایک تہائی مال کی وصیت، جہاد فی سبیل اللہ اور ایک تہائی کی وصیت اپنے غلاموں اور رشتے داروں کے حق میں کی جب کہ ایک تہائی اپنی اولاد کے حق میں چھوڑا۔ دریائے دجلہ پار کر کے، خلیفہ اپنے دستوں کے ساتھ رکے

اور کچھ دستوں کو زبطرہ کی طرف روانہ کیا۔ پتا چلا کہ رومی کاروائی کے بعد اپنے علاقوں میں لوٹ گئے ہیں۔ یہ دستے متاثرین کی مدد کے بعد واپس لوٹ آئے۔

راستے میں اطلاع ملی کہ رومی واپس چلے گئے ہیں۔ معتصم نے عموریہ پر حملے کا ارادہ کیا۔ رجب ۲۲۳ھ میں وہ عموریہ کی طرف روانہ ہوئے اور انقرہ سے ہوتے ہوئے عموریہ کا محاصرہ کر لیا۔ خلیفہ کے دو کمانداراَفشین اور اشناس پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کی فوج تین حصوں میں تھی ایک حصہ اَفشین کے زیرِ کمان تھا۔ دوسرا، اَشناس جبکہ تیسرا خلیفہ المعتصم کے زیرِ کمان تھا۔ محاصرے کے دوران منجیقوں سے سنگ باری جاری رہی۔ فوج کے تینوں حصے باری باری جنگ لڑتے ایک دن ایک حصہ لڑتا جبکہ دوسرے دن دوسرا، آخر کار چند دن کے بعد قلعہ اور شہر فتح ہو گیا۔ یہ رمضان تھا۔ کچھ دن یہاں مقیم رہنے کے بعد خلیفہ واپس ہو کر طرسوس آ گئے۔ اس فتح کے نتیجے میں مسلمانوں کو کثیر تعداد میں غلام اور مال غنیمت ہاتھ آئے۔ تیس ہزار رومی مقتول ہوئے اور تیس ہزار قیدی بنائے گئے۔ (الکامل، تاریخِ شاکر، معارک بین العرب والروم) معتصم اپنے بھائی کی طرح خلقِ قرآن کا قائل اور اس کا داعی تھا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو اسی کے دور میں مبتلائے آزمائش کیا گیا۔ ۲۲۷ھ میں المعتصم شدید بیمار ہوئے۔ مرَض الموت ہی میں انھوں نے اپنے بیٹے ہارون کو خلفیہ بنا دیا اور ان کی زندگی ہی میں بیعت خلافت کا انعقاد بھی ہو گیا۔

عہدِ ہارون بن محمد الواثق باللہ (۲۲۷ تا ۲۳۲ھ)

یہ المعتصم کے بیٹے اور مامون الرشید کے بھتیجے تھے۔ اپنے والد کی طرح خلقِ قرآن کے بدعی عقیدے کے داعی تھے۔ اس کے دور میں احمد بن نصر رحمہ اللہ کو خلقِ قرآن کی اعلانیہ مخالفت کے نتیجے میں شہید کیا گیا۔ البتہ زندگی کے آخری دور میں یہ اس عقیدے سے تائب ہو گیا تھا۔ سلطنتِ روم کے ساتھ اس عہد میں کوئی خاص مہم در پیش نہ ہوئی۔ عباسی جرنیل خاقان الخادم کے ذریعے سلطنتِ روم کے ساتھ قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ پیش آیا جس کے نتیجے دونوں طرف سے کثیر تعداد آزاد کی گئی۔ البتہ یہاں پر خلیفہ ہارون الواثق نے شقاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے تو رومی محاذ سے واپس آنے والے جرنیلوں کا خلقِ قرآن کے حوالے سے امتحان لیا گیا۔ جس کے نتیجے میں انکار کرنے والے کئی جرنیل شہید کر دیے گئے۔ دوسرا حکم اس نے

یہ جاری کیا کہ روم کی طرف سے آنے والے قیدیوں پر خلقِ قرآن کا عقیدہ پیش کیا جائے، جو اس عقیدے کی موافقت کریں انھیں قبول کیا جائے اور جو موافقت نہ کریں انھیں رومیوں کے پاس ہی چھوڑ دیا جائے۔ مسلمانوں کے پاس رومی قیدی زیادہ تعداد میں تھے۔ جو تبادلے کے بعد بچ رہے وہ احسان کرتے ہوئے رہا کر دیے گئے۔ ۲۳۲ھ میں واثق کا انتقال ہوا۔

عہدِ جعفر بن محمد المتوکل علی اللہ (۲۳۲ تا ۲۴۷ھ)

جعفر المتوکل بن معتصم، اپنے بھائی الواثق باللہ کے انتقال کے بعد خلیفہ بنائے گئے۔ خلیفہ بننے کے وقت ان کی عمر ۲۶ سال تھی۔ یہ اہلِ سنت کے عقیدے کے قائل اور خلقِ قرآن کے منکر تھے۔ امام ابنِ کثیر کے الفاظ میں ان کے دور میں سنت کا بول بالا اور بدعت کا قلع قمع ہوا۔ بعض لوگوں نے انھیں عمر بن عبد العزیز کے مثل قرار دیا ہے۔ جعفر المتوکل رحمۃ اللہ علیہ نے تمام شہروں کو خط لکھ کر خلقِ قرآن کے عقیدے کے فروغ کی ممانعت کی اور اس حوالے سے لوگوں پر سختی کو موقوف کیا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو بغداد بلا کر ان کا بہت اکرام کیا۔ الواثق کے ہاتھوں شہید ہونے والے محمد بن نصر کا جسد مبارک سولی سے اتروا کر وارثوں کے حوالے کیا۔ لوگ آپ کے جسم کو دیکھنے کے لیے آتے اور عقیدت سے چھو لیتے۔ خلقِ قرآن کے پرچارک ابنِ ابی داؤد کو معزول کیا اور امام احمد بن حنبل کی مشاورت سے یحیٰ بن اکثم کو قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ الواثق کے وزیر ابن الزیات کو معزول کر کے سزا دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے بدعنوانی کے خلاف کوشش کی اور عُمّال اور راشی افسروں کو سزائیں دیں اور ناجائز قبضہ کیے ہوئے اموال بحق بیت المال ضبط کیے گئے۔ المتوکل نے ذمیوں کے متعلق بھی بہت ساری اصلاحات کیں انھیں مسلمانوں جیسے حلیے اور لباس سے منع کیا۔

۲۳۵ھ میں خلیفہ المتوکل نے اپنے بعد اپنے تین بیٹوں کے حق میں ولیٔ عہدی کی وصیت کی۔ محمد، انھیں المنتصر کا لقب عطا کیا، زبیر انھیں المُعتزّ کا لقب دیا اور ابراہیم کو المؤیَّد کا لقب عطا کیا۔ جہاں تک المتوکل کے عہد میں روم کا معاملہ ہے تو ۲۳۱ھ میں ہونے والی روم مسلم صلح کی بدولت چند سال امن رہا۔ ۲۳۸ھ میں آرمینیا کے عیسائیوں نے بڑی بغاوت کھڑی کی اور یہاں کے امیر یوسف بن محمد بن یوسف کو شہید کر دیا۔ المتوکل نے بُغا الکبیر کو ادھر روانہ کیا جس نے عیسائیوں کو

ہزیمت سے دوچار کیا۔ اسی سال رومیوں نے مصر کی جانب دِمیاط کے علاقے پر سمندری راستے سے حملہ کیا۔ تین سو جہازوں کے ساتھ انھوں نے جامع مسجد کو آگ لگائی، بہت سارے مردوں کو قتل اور عورتوں کو قیدی بنالیا اور واپس لوٹ گئے۔ اس غارت گری کا جواب علی بن یحیٰ الارمنی نے بلادِ روم پر حملہ کر کے دیا۔ انھوں نے پہلے ۲۳۸ھ اور پھر ۲۳۹ھ میں روم کے علاقوں پر حملہ کر کے انھیں سخت سزا دی۔

۲۴۱ھ میں، تَوفیل بن میخائل کی بیوہ اور ملکۂ روم تھیوڈورا نے بہت سارے مسلمان قیدیوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے کا حکم دیا اور ایسا نہ کرنے والوں کو قتل کر دیا۔ اسی سال مِصّیصہ کی جانب عَین زَربہ کے مقام پر رومیوں نے حملہ کیا اور بہت سارے مسلمان مرد و عورتوں کو قیدی بنالیا گیا جنھیں بعد میں تاوان لے کر چھوڑا گیا۔ اس کے بعد علی بن یحیٰ الارمنی نے روم کی طرف حملہ کیا۔ اگلے سال جزیرہ کے علاقے میں شِمشاط (دریائے فرات کے ساحلی شہر) کی طرف حملہ کیا۔۔ سینکڑوں مسلمانوں کو قیدی بنایا اور آمد شہر تک چلے گئے۔ یہاں مسلمان مجاہدین اور عمر بن عبد اللہ الاقطع نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ کر اپنے علاقوں میں چلے گئے۔ خلیفہ المتوکل نے علی بن یحی کو بلادِ روم پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ ۲۴۳ھ میں المتوکل نے دمشق کی طرف سے بُغا کو بلادِ روم پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا جو گرمیوں کے موسم میں یہاں داخل ہوئے۔ میخائیل بن تیوفل قیصرِ روم نے ۲۴۵ھ میں قیدیوں کے تبادلے کی درخواست دی جس پر اگلے سال کہیں جا کر عمل درآمد ہوا۔ اسی سال روم نے سُمیساط (دریائے فرات کے غربی کنارے پر آباد رومی شہر جو اس وقت مسلمانوں کے قبضے میں تھا) پر حملہ کیا اور بہت ساری مسلمانوں کو قتل کیا اور پانچ سو کے لگ بھگ مسلمانوں کو قیدی بنالیا۔ اس کے جواب میں علی بن یحی الارمنی نے لگاتار دو سال روم پر حملہ کیا جبکہ ان حملوں میں عمر بن عبد اللہ الاقطع بھی شریک کماندار کے طور پر شامل تھے۔ اسی عرصے میں مسلمانوں نے سمندری راستے سے جہازوں کے ذریعے اِنضالیا پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیا۔ اس حملے میں مسلمانوں نے ۱۸ ہزار رومی قیدی بنائے۔ قیدیوں کے تبادلے میں اڑھائی ہزار کے لگ بھگ مسلمان قیدیوں کو آزاد کرایا گیا۔ ۲۴۷ھ میں المتوکل نے اپنے بیٹے زبیر المُعتزّ کو محمد المنتصر پر سبقت دینا چاہی اور منتصر سے مطالبہ کیا کہ وہ اس حکم کو تسلیم کرے لیکن اس نے انکار کیا۔ خلیفہ کا محافظ دستہ ترک سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ منتصر نے ترک سپاہ سے ساز باز

کی اور ایک رات اس نیک دل خلیفہ کو شہید کر دیا۔

المتوکل کے خاتمے پر عباسیوں کا دورِ اول ختم ہوا جو قوت اور شان و شوکت کا دور کہلاتا ہے۔ متوکل کی حکومت کا خاتمہ، دورِ زوال کی ابتدا کہلائی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ اس دور میں حکومتی معاملات میں فوج کی شرکت عام طور پر پائی جاتی تھی کہ ہر حکمران لازما فوجی بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فوجی معاملات حکومت پر غالب نہیں ہوتے تھے۔ المنتصر کے ایما پر، ترک فوجیوں کے ہاتھوں خلیفہ المتوکل کی شہادت، فوجی مداخلت بلکہ غلبے کی ایک نشانی تھی۔ دورِ اول میں اگرچہ ادارۂ خلافت سے آزاد مسلمانوں کی ریاستیں موجود تھیں، مثلاً تونس میں اغالبہ، اندلس میں امویہ، فاس میں ادارسہ کی حکومت لیکن دورِ ثانی میں مشرق کی طرف بھی آزاد مسلمان ریاستوں کا قیام شروع ہو گیا۔ اس کی انتہا منگولوں کے ہاتھوں سقوطِ بغداد پر ہوتی ہے۔ (تاریخ محمد الشاکر)

محمد بن جعفر المنتصر باللہ (۲۴۸ھ)

یہ اپنے باپ کو قتل المتوکل کر کے خلافت پر قابض ہوا تھا۔ فوج میں ترکی افسروں کا غلبہ تھا۔ جو المتوکل کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔ وہ اس بات سے خائف تھے کہ منتصر کے بعد اس کے دوسرے بھائی جو ولیٔ عہد مقرر ہو چکے تھے خلیفہ نہ بن جائیں۔ ان افسران کے مشورے اور دباؤ پر المنتصر نے دھونس اور دھاندلی سے دونوں ولیٔ عہدوں سے استعفیٰ لے لیا۔ لیکن اسی دوران المنتصر بیمار ہو کر راہیٔ مُلکِ عدم ہوا۔ وہ صرف ۶ ماہ ہی تخت پر بیٹھ سکا تھا۔ اس کے دور میں شاہِ روم نے بلادِ شام پر چڑھائی کے لیے پیش رفت کی۔ جس کے جواب میں خلیفہ المنتصر نے وصیف ترکی کو ایک لشکر جرار کے ساتھ روم پر چڑھائی کا حکم اس تاکید کے ساتھ دیا کہ لڑائی سے فارغ ہو کر سرحدوں پر مقیم رہے تاکہ آئندہ بروقت جوابی کاروائی کی جاسکے۔ (تاریخِ ابن کثیر)

احمد بن محمد المستعین باللہ (۲۴۸ تا ۲۵۲ھ)

منتصر کے انتقال کے بعد فوجی افسران نے احمد بن محمد المعتصم کو خلیفہ بنایا جو منتصر کے چچا تھے۔ المستعین کے دور میں

عمر بن عبد اللہ الاقطع کی زیرِ قیادت، ملاطیہ کی طرف رومیوں سے جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ سپاہ سالار سمیت ایک ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ بدلے کے طور پر نامور کماندار علی بن یحیٰ الارمنی نے رومی علاقوں پر حملہ لیکن یہاں بھی وہی صورت پیش آئی کہ کمانڈر چار سو مسلمانوں سمیت شہید ہو گئے۔ اس سے مسلمانوں کو بہت مشکلات پیش آئیں۔ المستعین کا دور بہت پر آشوب تھا۔ ان کے عہد میں طبرستان، حمص، کوفہ، قزوین وغیرہ میں شورشیں برپا رہیں۔ کچھ ترک فوجی افسر خلیفہ سے ناراض ہو گئے۔ انھوں نے سابقہ ولی عہد المعتز کو جیل سے فرار کرا کر سامراء پہنچایا جہاں ان کی بیعت کی گئی۔ اس کے بعد سامراء سے ایک لشکر بغداد پر حملہ آور ہوا۔ غیر فیصلہ کن لڑائی کے بعد ایک معاہدے کے تحت المستعین باللہ مستعفی ہو گئے اور المعتز کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لی گئی۔

زبیر بن جعفر المعتز باللہ (۲۵۲ تا ۲۵۵ھ)

یہ المتوکل کے بیٹے اور سابقہ ولی العہد تھے۔ ان کا نام محمد بن جعفر بھی بتایا گیا ہے۔ ان کے دور میں افراتفری ہی رہی۔ امرا کی محاذ آرائی کے علاوہ خوارج نے بھی غُل مچائے رکھا۔ روم کے ساتھ ایک معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ۲۵۵ھ میں معتز نے استعفی دے دیا۔ امرا نے ان کے ساتھ نہایت اہانت آمیز سلوک کیا اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ چند دن بعد یہ جاں بحق ہو گئے۔

محمد بن ہارون المہتدی باللہ (۲۵۵ تا ۲۵۶ھ)

محمد بن ہارون؛ المعتز کے چچا زاد تھے۔ یہ ایک نیک دل اور عبادت گزار آدمی تھے۔ جب المعتز کو معزول کیا گیا تو محمد بن ہارون کو بغداد سے سامراء بلا کر ان سے بیعت لینے کی درخواست کی۔ انھوں نے المعتز سے ملاقات کیے بغیر بیعت سے انکار کیا اور ملاقات پر المعتز کو امیر المومنین کہہ کر سلام کیا۔ جب معتز نے خود خلافت سے عاجزی کا اظہار کیا اور سب سے پہلے خود المہتدی کے ہاتھ پر بیعت کی تو انھوں نے خلافت کے منصب کو قبول کیا۔ (تاریخِ شاکر)

یہ لگاتار روزے رکھا کرتے۔ ناچ گانے اور موسیقی سے پرہیز کرتے۔ بہت معمولی کھانا کھایا کرتے۔ ان کا گھر بھی

سادہ سا تھا اور اس میں ساز و سامان بھی بقدرِ ضرورت اور عام سا تھا۔ یہ کہا کرتے کہ میں عمر بن عبد العزیز کی راہ پر چلنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے ناچ گانے پر پابندی لگائی۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا انتظام کیا اور لوگوں کے مسائل سننے کے لیے کھلی کچہری لگایا کرتے۔ امرا اور کمانداروں کے ہاتھوں، خلفا کی اہانت و معزولی کا انھیں رنج تھا اور انھوں نے اس رواج کو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہے اور باغی فوجوں کے خلاف جنگ میں شکست کھا کر مقتول ہوئے۔ المہتدی کی حکومت ایک سال پر محیط رہی، جس میں رومی محاذوں پر کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

احمد بن جعفر المعتمد علی اللہ (۲۵۶ تا ۲۷۹ھ)

المہتدی باللہ کے بعد احمد بن جعفر؛ المعتمد علی اللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ بنائے گئے۔ ۲۶۱ھ میں انھوں نے اپنے بیٹے جعفر کو ولیٔ عہد بنایا اور اس کے بعد اپنے بھائی المُوَفَّقْ کو ولیٔ عہد مقرر کیا۔ ان کے بھائی ایک لائق اور انصاف پسند شخصیت تھے اور حکومت کے اکثر اختیار انھی کے پاس تھے۔ خلیفہ نے خوش ہو کر انھیں ناصر الدین کا لقب عطا کیا تھا۔ ۲۷۸ھ میں الموفق کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ ان کے بیٹے احمد بن الموفق کو ولیٔ عہد مقرر کیا گیا اور خلیفہ نے اپنے بیٹے جعفر کو معزول کر دیا۔ اگلے سال ۲۷۹ھ میں خلیفہ کا انتقال ہو گیا۔ المعتمد کا دور داخلی انتشار سے بھرپور تھا۔ عبیدیوں کی تحریکِ زَنج، قرامطہ، اسماعیلیہ، صفاریہ کے علاوہ علوی تحریک نے بھی سرکشی کی۔ خلافتِ بغداد کی زیادہ تر صلاحیتیں انھی لڑائیوں سے نمٹنے میں صرف ہوئیں۔ مصر میں ایک عرصے سے ترک امیر، احمد بن طولون کی خود مختار لیکن خلافتِ بغداد کی دوست ریاست قائم تھی۔ ابنِ طولون کے بعد اس کے بیٹے خمارویہ کی حکومت میں مصر اور بغداد کے مابین کشیدگی اور لڑائی ہوئی لیکن پھر صلح ہو گئی۔

روم کے حالات

۲۵۷ھ میں بَسیل الصَّقلَبی نام کماندار، شاہِ روم میخائل کو قتل کر کے تخت پر براجمان ہوا۔ اس کے بعد روم مسلم لڑائیوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوا۔ ۲۵۷ھ میں رومیوں نے ملطیہ پر حملہ کیا مسلمانوں نے کامیابی سے دفاع کیا لیکن

۲۶۰ھ میں انھوں نے مسلمانوں سے لولوۃ شہر چھین لیا۔ ۲۶۴ھ میں مسلمان عبداللہ بن رشید بن کاؤس کی قیادت میں بلادِ روم پر حملہ آور ہوئے لیکن شکست کھا کر پسپا ہوئے اور مسلمان کماندار بھی قیدی بنا لیے گئے۔ ۲۶۵ھ میں احمد بن طولون انطاکیہ کی طرف سے روم میں داخل ہوئے لیکن اہلِ روم نے ان سے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ اسی سال روم نے اناطولیہ کے علاقے اضنہ کی طرف سے حملہ کیا اور چار سو مسلمان قیدی بھی ساتھ لے گئے۔ ۲۶۶ھ میں انھوں نے دیار بکر کی طرف لوٹ مار کی اور ۲۵۰ مسلمان قیدی ساتھ لے گئے۔ البتہ جزیرہ کے علاقے نصیبین کے مسلمانوں نے پیچھا کر کے حملہ کیا اور رومیوں کو شکست دی اور ان کا کماندار مارا گیا۔ ۲۶۶ھ میں ابنِ طولون کی فوج شام کی طرف سے بلادِ روم میں میں داخل ہوئی اور باوجود قلتِ تعداد کے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور رومیوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ۲۷۰ھ میں رومیوں نے ایک لاکھ کے لشکرِ جرار کے ساتھ طرسوس کی طرف سے حملہ کیا۔ یہاں مسلمانوں نے انھیں شکست دی، ان کے کماندار سمیت بڑی تعداد مقتول ہوئی۔ ۲۷۴ھ میں یازمان الخادم نے بلادِ روم پر حملہ کیا اور اور فتح پائی۔ بہت سارے رومی قتل ہوئے اور مسلمانوں کو بھاری مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ (تاریخِ شاکر، ج:۶، ص:۶۴ تا ۷۷)

جاری ہے

* * * * *

مولانا حماد احمد ترک
نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سفر نامۂ ترکی (۳)

آج ۱۵ نومبر ہے اور استنبول میں ہماری پہلی صبح ہے۔ کل کا دن تو سفر کی تھکن کی نذر ہو گیا تھا۔ آج اس ولولے کے ساتھ کہ استنبول کی سڑکوں پر دن گزرے گا اور عثمانی یادگاروں سے آنکھوں کو فرحت پہنچے گی، رہائش گاہ سے باہر نکلے۔ سورج اب تک تاریکی کی چادر اوڑھے روپوش تھا۔ غالباً ہم سے پہلے استنبول میں اترنا اسے گوارا نہ ہوا ہو گا۔ باہر نکلے تو نیم تاریکی کا عالم تھا۔ موسم کافی سرد تھا۔ گردن میں گلوبند نہ ہوتا تو بادِ زمہریر (سرد ہوا) دم نہ مارنے دیتی۔ جیسے ہی دروازہ کھولا تو دروازے کے سامنے ایک سبزی فروش دکان سجائے بیٹھا تھا۔ ذرا آگے جھانک کر دیکھا تو نظر آیا کہ پورا بازار لگا ہوا ہے۔ آج دراصل پیر کا دن تھا اور یہاں ہر پیر کو پیر بازار لگتا ہے۔ گاڑیوں کی آمد و رفت اور چیخ پکار اسی سبب سے تھی جس کا ذکر گزشتہ قسط میں ہوا۔ ایک معمولی سبزی سے لے کر، گرم مسالے، پھل، برتن، گوشت، صابن، بالٹیاں الغرض قسم قسم کی اشیا سجائے یہ تاجر طلوعِ فجر سے قبل ہی شہر کے کونے کونے سے امڈ آئے تھے اور بوقتِ فجر یہ بازار پوری آب و تاب پر تھا۔ اسی اندھیرے میں ملازم اپنی اپنی ملازمتوں کے لیے بھی جاتے ہوئے نظر آئے۔ ہم نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ناشتے کے لیے ضروری خریداری کی اور واپس رہائش گاہ میں آکر ناشتے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ ناشتہ کر کے باہر آئے اور مشورہ ہوا تو یہی طے پایا کہ پیدل سفر کیا جائے۔ چنانچہ سلطان فاتح مسجد کی طرف سفر شروع ہوا۔ صبح کا وقت تھا اس لیے بے شمار لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ اکثر لوگ پیدل سفر کر رہے تھے۔ ہم ذرا سا آگے بڑھے تو اطفائیہ کا دفتر نظر آیا۔ یہ زمانۂ قدیم کا فائر بریگیڈ اسٹیشن تھا جو نسبتاً بلندی پر واقع تھا۔ یہاں پر سرکاری محکمے کے افراد بلندی سے استنبول

شہر کا جائزہ لیتے تھے اور جہاں کہیں آگ لگی نظر آئے اسے بجھانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ استنبول میں آگ بہت زیادہ لگتی تھی۔ کیوں لگتی تھی اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ بہرحال اب وہ جدید سہولیات سے آراستہ فائر بر گیڈ کا دفتر ہے۔ اس سے تھوڑا سا آگے ایک اونچی سی دیوار نظر آئی۔ بتایا گیا کہ یہ در حقیقت پانی کی گزر گاہ ہے جس کے ارد گرد دو دیواریں ہیں اور یہاں سے پورے شہر کو پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ اسی دیوار کے ساتھ ایک قہوہ خانہ روایتی طرز کا بنا ہوا تھا۔ ایسے قہوہ خانے دیکھ کر بے وجہ ہی وہاں بیٹھ جانے کو جی چاہتا ہے۔ یوں تو ہمارے ہندوستانی سیاح جب بھی عثمانی دور کے استنبول میں آئے انھوں نے ان قہوہ خانوں کو خصوصی موضوع بنایا۔ یہ قہوہ خانے اسی دور کی یادگار ہیں جو ہر کچھ فاصلے پہ نظر آتے ہیں۔ یہاں ہمہ وقت قہوہ دستیاب رہتا ہے۔ پیشکش بھی بہت خوب ہوتی ہے۔ کانچ کی چھوٹی چھوٹی مگر دیدہ زیب پیالیوں کو ترتیب کے ساتھ سجا کر پیش کیا جاتا ہے۔ قہوہ پھیکا ہی بنایا جاتا ہے۔ کوئی چینی استعمال کرنا چاہے تو الگ سے فراہم کی جاتی ہے۔ یہ منظر ایک لمحے کے لیے قہوہ نوشوں کو عظیم عثمانی دور میں دھکیل دیتا ہے خاص کر اس وقت جب آپ نے کسی قدیم سفرنامے میں ان قہوہ خانوں اور ان کی رونقوں کا قصہ پڑھا ہوا ہو۔ بلا مبالغہ اس سارے پس منظر میں یہ قہوہ کئی طرح لطف و لذت کا باعث بنتا ہے۔

قہوہ خانے سے ذرا آگے ایک چھوٹا سا بازار تھا جسے بُریان بازار کہتے ہیں۔ بازار سے گزر کر پھر سڑک کی طرف واپس آئے تو وہاں ایک یادگار نظر آئی۔ یہ یادگار ۱۵ جولائی ۲۰۱۶ء میں ہونے والی ناکام فوجی بغاوت کی تفصیل اور اس موقعے پر شہید ہونے والے ترکوں کی تھی۔ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے کنارے پر مجسمے بنائے گئے تھے جنھیں وضو کرتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ ان مجسموں میں سے ایک مجسمے کو عمامے اور جبے میں ملبوس دکھایا گیا تھا جو وہاں کے علما کا لباس ہے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ ناکام فوجی بغاوت میں در حقیقت ان نمازی مسلمانوں اور ان کی سرپرستی کرنے والے علما کا نمایاں کردار ہے۔ ترکی زبان میں جولائی کو ''تیموز'' کہتے ہیں اور جہاں کہیں اس بغاوت سے جانی یا مالی نقصان ہوا وہاں یادگار کے طور پر ۱۵ تیموز رسمِ انگریزی میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ شہدا کی اس یادگار کے ساتھ ایک کتبہ بھی نصب تھا جس پر درج ذیل معلومات تحریر تھیں:
''سراج خانہ، ۱۵ جولائی، ۱۵ جولائی کی رات باغی استنبول کی مرکزی بلدیہ پر حملہ آور ہوئے اور گولیاں چلانے لگے، گولیوں کی

بوچھار ان لوگوں پر کی گئی جو اپنے وطن کے دفاع میں نکلے تھے۔ جس دوران اس سانحے کے شہدا اور سپاہیوں کا مقابلہ کرنے والے رضا کاروں کی تصاویر اور سرکاری کیمروں سے حاصل شدہ فلمیں دیکھی گئیں تو اس عظیم تاریخی منظر کو بھی کیمروں میں محفوظ پایا گیا (یعنی یہ منظر کہ ایک طرف گولیاں چل رہی ہیں اور دوسری طرف یہ لوگ وضو کر رہے ہیں)۔ ہمارے محبِ وطن بہادروں کے پاس اس بغاوت کے مقابلے کی کوئی تیاری نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ جذبۂ ایمانی سے سرشار تھے اور وضو سے اپنے ایمان میں اور اضافہ کر رہے تھے''۔ اس کے بعد ذرا نیچے سرخ رنگ میں نمایاں کر کے یہ جملہ لکھا گیا تھا: ''ایسا اس لیے ہوا کہ یہ لوگ موت سے خائف نہیں تھے بلکہ یہ بے وضو مر جانے سے ڈرتے تھے''۔ اس کے بعد لکھا تھا: ''ہم اس جدوجہد پر اپنے شہدا اور رضا کاروں کے مشکور و ممنون رہیں گے''۔

اس مقام سے آگے بڑھے تو شہزادہ مسجد نظر آئی جس کا سرسری ذکر پہلی قسط میں ہو چکا۔ فاتح بلدیہ کی تیسری چوٹی پر موجود یہ مسجد سلطان سلیمان القانونی کے حکم پر معمار سنان نے تعمیر کی۔ اس کی تعمیر ۱۵۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ معمار سنان کی تعمیر کردہ یہ پہلی مسجد تھی۔ سلطان سلیمان نے اپنے بیٹے ''شہزادہ محمد'' کی یاد میں یہ مسجد بنوائی جس کا انتقال ایک جنگ سے واپسی پر ۱۵۴۳ء میں ہو گیا تھا۔ عثمانی طرزِ تعمیر کا شاہ کار یہ مسجد وسیع احاطے پر قائم ہے جس میں درس گاہیں، مسافر خانہ اور مزار شامل ہیں۔ اسی کے احاطے میں سلطان سلیمان کا بیٹا محمد اور سلطان سلیمان کی بیٹی مہرماہ سلطان کا شوہر یعنی سلطان سلیمان کا داماد رستم پاشا مدفون ہیں۔ ہم اس مسجد میں داخل نہیں ہو سکے، بس باہر سے ہی مسجد کی زیارت کی اور پھر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ سلطان محمد فاتح اور ان کے وزرا کے مجسمے نظر آئے۔ سلطان کو گھوڑے پر سوار اور ان کے وزرا کو ساتھ کھڑے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہاں سے آگے بڑھے تو جامعہ استنبول کی عمارت نظر آئی۔ یہ جامعہ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے تعمیر کروائی تھی۔ جامعہ کے احاطے کے ساتھ چلتے چلتے ایک مقام پر استنبول کارڈ لینے کے لیے رک گئے۔ پس منظر میں ایک مسجد نظر آ رہی تھی لیکن بند تھی، قریب سے نہیں دیکھ سکے، غالباً بایزید مسجد تھی۔

جس دوران کارڈ خریدنے والوں کی قطار ختم ہوتی ہے اس دوران ہم آپ کو استنبول کارڈ کا قصہ بھی سنائے دیتے ہے۔ استنبول کارڈ استنبول میں مقیم شہریوں اور سیاحوں دونوں کے لیے انتہائی مفید کارڈ ہے۔ یہ اے ٹی ایم کارڈ کی طرح ایک کارڈ

ہے جس میں کسی بھی مقررہ دکان یا مشین سے لوڈ کروایا جاسکتا ہے۔ سیاحوں کا کارڈ ان کے پاسپورٹ نمبر کے تحت رجسٹرڈ ہوتا ہے۔ بس، ٹرام یا ٹرین میں سفر کرنا ہو یا کسی تفریحی مقام میں ٹکٹ کی ادائی کرنی ہو، مقررہ جگہ پر ایک لمحے کے لیے رکھیں اور واپس اٹھالیں۔ خود بخود کٹوتی ہوجائے گی۔ وقت بھی بچتا ہے اور کرایہ پوچھنے اور بقایا لینے کی زحمت بھی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر عوامی بیت الخلاء بھی اس کارڈ سے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ استنبول کارڈ حاصل کرنے کے بعد ہمارا رخ گرینڈ بازار کی طرف تھا۔ گرینڈ بازار دنیا کے ان قدیم بازاروں میں سے ایک ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے کشش کا مرکز ہے اور صدیوں سے آباد اور بارونق ہے۔ تقریباً چار ہزار دوکانوں اور پچاس سے زائد راہداریوں پر مشتمل یہ بازار ہمہ وقت ہزاروں سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہتا ہے۔ اسے دنیا کا پہلا جامع بازار (جسے انگریزی میں mall کہہ سکتے ہیں) ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس بازار کا آغاز سلطان محمد فاتح کے عہدِ حکومت میں ۱۴۵۵ء میں ہوا۔ سلطان کے اس منصوبے کے تحت بازار میں مختلف مقامات پر مساجد اور مسافر خانے بھی تعمیر کیے گئے۔ بازار کی گلیوں کو اس مقام پر واقع مشہور تاجر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ گرینڈ بازار کی تعمیر و تزئین آج بھی عثمانیوں کے اعلیٰ ذوق اور فنِ تعمیر میں زبردست مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس بازار سے نکل کر یُمنی مارکیٹ پہنچے۔ بس یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ استنبول کا اردو بازار ہے۔ تہہ خانے میں بھی متعدّد مکتبے ہیں اور پہلی منزل پر بھی، جن میں ترکی، انگریزی اور عربی کتب بکثرت دستیاب ہیں۔

یہاں سے ہمارا رخ اس منزل کی طرف ہوگیا جس کی زیارت کے لیے آج گھر سے چلے تھے۔ بلا شبہہ آج کے استنبول میں اگر اسلامی سیاحتی مقامات کی فہرست بنائی جائے تو تین مقامات سرِفہرست ہوں گے۔ اول سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار شریف، دوم سلطان محمد فاتح کی مسجد اور مزار، سوم آیا صوفیہ۔ ہماری مراد مؤخر الذکر مقام یعنی آیا صوفیہ ہے۔ آیا صوفیہ کی عمارت انتہائی قدیم عمارت ہے جس کی تاریخ تقریباً ۱۵ صدیوں کو محیط ہے۔ اس کی تعمیر بازنطینی دور میں ہوئی اور عیسائیوں کی مرکزی عبادت گاہ کے طور پر معروف رہی۔ سلطان محمد فاتح نے فتحِ قسطنطنیہ کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اس سے کلیسا کی علامات کو ہٹا کر اسلامی رنگ سے مزین کیا۔ جگہ جگہ عیسائیت کی نمائندہ شکلیں بنی ہوئی تھیں ان پر رنگ پھروا دیا اور قرآنی آیات کی خطاطی آویزاں کی۔ تقریباً ۵۰۰ سال تک آیا صوفیہ میں نمازِ باجماعت جاری رہی تاآنکہ سقوطِ

سلطنتِ عثمانیہ کے بعد اتاترک نے اس کی مسجد والی حیثیت ختم کر کے اسے عجائب گھر بنا دیا۔ اس کی دیواروں سے کھرچ کھرچ کر اسلامی نشانیاں ہٹائی گئیں اور قدیم عیسائی تصاویر پھر سے سامنے آگئیں۔ اب اس میں ہر طرح کے لوگ آنے لگے اور جوتوں سمیت اس میں گھومنے لگے۔ کئی نیک سیرت لوگ اس کی زیارت کو آتے لیکن مسجد میں جوتوں سمیت داخلہ اور مسجد کی پامالی میں حصہ لینا انھیں گوارا نہ ہوتا اور وہ اس دعا کے ساتھ نم ناک لوٹ جاتے کہ اے خداوند! اسے اس کی سابقہ حالت پر لوٹا دے۔ بالآخر وہ وقت آیا اور ۲۰۲۰ء میں ترک حکومت نے ایک عدالتی حکم نامے کے تحت آیا صوفیہ کو دوبارہ مسجد قرار دیا اور اسے باجماعت نماز کے لیے کھول دیا۔ اس وقت سے اب تک الحمدللہ اس مسجد میں ہزاروں زائرین آتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔ اس مسجد کا مکمل نام آیا صوفیہ کبیر ہے۔ نمازِ ظہر کے وقت ہم آیا صوفیہ پہنچے تھے چنانچہ زائرین کی قطار میں شامل ہو کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ حسبِ معمول نمازِ باجماعت کے بعد امام صاحب نے تلاوت فرمائی۔ تلاوت کے بعد ہم نے مسجد کا مختصر دورہ کیا۔ دائیں طرف ایک بلند مقام پر مؤذن کی جگہ مختص تھی۔ عموماً تمام مساجد میں مؤذن کے لیے الگ جگہ مختص ہوتی ہے۔ اس سے آگے خطیب کے لیے کئی درجات پر مشتمل بلند منبر تھا۔ مختلف سمتوں میں قرآنی آیات کی خطاطی آویزاں تھی۔ کہیں کہیں عیسائی علامات بھی نظر آ رہی تھیں۔ کسی جگہ صلیب کا نشان اور کسی جگہ کوئی تصویر۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ کلیسا کے بنائے گئے صدارتی مقام اور قبلے کے رخ میں زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے اسے مسجد میں تبدیل کرنا نسبتاً آسان تھا۔ محراب کے اوپر یہ قرآنی آیت لکھی تھی: ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ یہی آیت متعدّد مساجد میں محراب پر لکھی ہوئی نظر آئی۔ مسجد سے باہر آئے تو سامنے ایک سیمت والا نظر آیا۔ سیمت ایک روایتی ترک سوغات ہے جو ڈبل روٹی سے مشابہ لیکن گولائی میں بنی ہوتی ہے۔ اس پر بکثرت تل جڑے ہوتے ہیں۔ ترک عموماً سیمت کھاتے نظر آتے ہیں، کہیں راہ چلتے اور کہیں اثنائے مجلس۔ سیمت کھانے کے بعد ہمارا رخ استنبول کے اہم ترین میوزیم "توپ کاپی" کی طرف ہو گیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج مرمتی امور کی وجہ سے میوزیم بند ہے۔ چنانچہ ہم لوٹ آئے اور قارئین کو بھی اس کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں، یہ کہانی پھر سہی۔ ہاں، اتنا ضرور بتائے دیتے ہیں کہ آپ میں سے کوئی استنبول جائے تو ضرور یہاں کا دورہ کرے۔ یہاں پر نبی اکرم ﷺ کے تبرکات بھی موجود ہیں، صحابہ کے آثار

بھی اور دیگر خلفا و سلاطین کی اشیا بھی۔ اس میوزیم سے سمندر کا نظارہ بہت عمدہ اور فرحت بخش ہے۔ یہاں اور کچھ نہ بھی ہو تب بھی اس منظر کے لیے یہاں تک آنا گھاٹے کا سودا نہیں۔

آیا صوفیہ کے بالکل سامنے ایک اور مشہور مسجد سلطان احمد مسجد ہے جسے انگریزی میں Blue mosque بھی کہتے ہیں۔ ساری دنیا اس مسجد کو استنبول کی علامت قرار دیتی ہے جیسے شاہ فیصل مسجد اسلام آباد کی علامت ہے۔ بحرِ مرمرہ کے کنارے واقع یہ مسجد بھی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ نمازِ عصر کے وقت ہم مسجد میں داخل ہوئے۔ مسجد کا اکثر حصہ مرمتی امور کی وجہ سے بند تھا، بہت تھوڑا سا حصہ نماز کے لیے کھلا ہوا تھا۔ اس چھوٹی مگر انتہائی خوب صورت مسجد کے حسن کی بڑی وجہ اس کی سبز اور نیلی ٹائلیں ہیں جن پر سورج کی کرنیں طرح طرح کے رنگ سجاتی ہیں۔ اسی سبب سے اسے نیلی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ سلطان احمد اول کے عہد میں ۱۶۱۷ء میں اس مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اسے معمار سنان کی تعمیر کردہ شہزادہ مسجد کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ تعارفی کتبے پر لکھا ہے کہ اس کے چھے مینار ہیں۔ اور یہ اپنے عہد میں مسجدِ حرام کے بعد دوسری مسجد تھی جس کے چھے مینار تھے۔ اس کی تعمیر کے بعد مسجدِ حرام میں ایک اور مینار کا اضافہ کر دیا گیا۔ مسجد سے نکلے تو ساحلِ سمندر کی طرف جانا طے پایا۔ اس کے لیے استنبول کارڈ استعمال کرتے ہوئے ٹرام میں سوار ہوگئے۔ ٹرام کے اسٹیشن سے قبل ایک مقام ”یری بتان“ کے نام سے تھا جس میں بازنطینی دور کی باقیات تھیں۔ یہ کسی محل کے لیے فراہمی آب کا نظام تھا، لیکن یہ مقام بھی مرمت کے لیے بند کیا ہوا تھا۔

اگلی منزل ”ایمی نونو“ تھی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ کراچی کا کیماڑی تھا جہاں چھوٹے بڑے جہاز لنگر انداز تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے مچھلی سے تیار شدہ موجود تھے۔ ہم نے صرف مچھلی کے سینڈوچ پر اکتفا کیا۔ یہاں سے آگے بس میں اکسرائے پہنچنا تھا جہاں دیگر حضرات بھی ہمارے منتظر تھے۔ عشائیہ انھی کے ساتھ طے تھا اور عشائیے کے لیے ایک یمنی ہوٹل ”حضرموت“ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یمن کے روایتی کھانوں کے لیے بلا شبہہ یہ ایک عمدہ انتخاب تھا۔ مختلف قسم کے کھانوں اور بالخصوص روٹی کی عمدگی کا جواب نہیں تھا۔ عملے کا اخلاق بھی قابلِ تعریف تھا۔ اگرچہ یہ تمام ذائقے لاجواب اور شاندار تھے لیکن کھانے کے اختتام پر جو کچھ انھوں نے پیش کیا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ استنبول میں اگر حضرموت ہوٹل والے

سارے کھانے بند کر دیتے اور صرف یہی ایک پیشکش باقی رکھتے تو کچھ عجیب نہ ہوتا۔ اس آخری نعمت کو دیکھ کر بے اختیار فیض کا مصرع زبان پر آگیا کہ ''جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے'' اور ''جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے''۔ خیر ہمارا قرار بے وجہ نہیں تھا۔ دو دن سے جس شے کی تلاش تھی اور جس کے حصول کی قطعاً کچھ امید نہ بچی تھی کون جانتا تھا کہ وہ یہاں اکسرائے کے حضر موت میں وافر دستیاب تھی۔ لیکن رمضان میں کھانے پینے کا اتنا ذکر مناسب نہیں لہٰذا اس نعمت کا ذکر عید پر اٹھائے رکھتے ہیں۔

جاری ہے

*****

محمد عثمان خان
معاون قلم کار

امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۲)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفۂ اخلاق پر جو کچھ بحث کی ہے وہ کسی حد تک حکماے یونان سے ماخوذ ہے، لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس پر خاطر خواہ اضافہ بھی کیا ہے۔ ان کے بیان کردہ فلسفۂ اخلاق کے ابتدائی اصول ابنِ مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق سے مستفاد ہیں، جو اصلاً حکماے یونان کے فلسفۂ اخلاق کا خلاصہ ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے ابنِ مسکویہ کے مثل اخلاق کی قسمیں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ”خُلق کے بنیادی ارکان چار ہیں: علم، غضب، شہوت اور عقل۔ ان ہی قوتوں کے اعتدال کا نام حسنِ خُلق ہے۔ علم کی قوت کے اعتدال کا نام حکمت ہے۔ غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو تو اس کو شجاعت کہتے ہیں۔ قوت کے مختلف مظاہر ہیں۔ ہر مظہر کا نام جدا ہے۔ مثلاً خود داری، دلیری، آزادی، علم، استقلال، ثبات، وقار۔ یہ قوت جب اِفراط کی طرف مائل ہوتی ہے تو تہوُّر (مذموم شجاعت) بن جاتی ہے اور اس سے غرور، نخوت، خود پرستی، خود بینی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی اور دِنائَت کے قلب میں ظاہر ہوتی ہے۔ شہوت کی قوت میں جب اعتدال ہوتا ہے تو اسے عِفّت کہتے ہیں۔ یہی صِفَت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے، مثلاً جود، حیا، صبر، درگزر، قناعت، پرہیزگاری، لطیف مزاجی، خوش طبعی، بے طمعی وغیرہ۔ جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے تو حرص، طمع، بے شرمی، فضول خرچی، ریا، اوباشی، رندی، تملّق، حسد، رشک وغیرہ جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ عقل کی قوت معتدل رہتی ہے تو حسنِ تدبیر، جودتِ ذِہن اور اصابتِ رائے پیدا کرتی ہے۔ جب اس میں افراط آتا ہے تو مکر، فریب، حیلہ سازی، عیاری کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور تفریط ہوتی ہے تو حماقت، سادہ پن،

نافہمی، عاقبت نااندیشی جیسے اوصاف رونما ہوتے ہیں‘‘۔[1] فلاسفہ کے درمیان ایک مسئلہ یہ زیرِ بحث رہا ہے کہ اخلاق میں اصلاح وفساد کی قابلیت ہے یا نہیں؟ بہ الفاظِ دیگر انسان بالطبع شریر پیدا ہوتا ہے یا شریف؟ اس سلسلے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ارسطو کی رائے اختیار کی ہے کہ بداخلاقی یا خوش اخلاقی کوئی چیز انسان کی طبعی اور جبلّی نہیں، جو کچھ ہے تعلیم وتربیت کا اثر ہے۔ چونکہ تربیت کی بنیاد بچپن میں پڑتی ہے اس لیے انھوں نے بچوں کی اخلاقی تربیت کے موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ حصہ بھی ابنِ مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق سے ماخوذ ہے۔ ان موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جابہ جا اضافے کیے ہیں اور قیمتی معلومات پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر ابنِ مسکویہ نے اخلاقی امراض کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں: تہوّر، جُبُن، حرص، جُمود، سفاہت، بلاہت، جوراور ذلت۔ ان میں سے صرف اوّلُ الذکر دو امراض کے علاج کے طریقے بتائے ہیں، بقیہ سے تعرض نہیں کیا ہے، جب کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام اخلاقی امراض کا استقصا کیا ہے اور ایک ایک مَرَض کی حقیقت وماہیت، تشخیص اور علاج کے طریقے تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے حسد، جاہ پرستی، ریا، عُجب، غرور، غضب، بُخل، غیبت، کِذب، فضول گوئی، چغل خوری، مزاح وغیرہ میں سے ایک ایک کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور اس پر فلسفیانہ انداز سے بحث کی ہے۔ اِحیاء العلوم کا ایک اہم باب ذمّ الغرور کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے علماے زُہّاد، حجّاج، اصحابِ مال اور دیگر طبقات کی اخلاقی خرابیوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ بعض اخلاقی اوصاف میں بڑا دقیق اور نازک فرق ہوتا ہے، کہ ان میں امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہے، مثلاً بخل اور کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف، پست ہمتی اور قناعت، دنائت اور تواضع، غرور اور خودداری۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت نکتہ سنجی سے ان کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے درمیان فرق کی وضاحت کی ہے۔ اخلاقی امراض کی تشخیص کے بعد دوسرا مرحلہ ان کے علاج کا ہے۔ حکماے یونان نے اس کے دو طریقے قرار دیے تھے۔ ایک علاج بالضد کا طریقہ ہے، یعنی جس وصف کا مرض ہو اس کے برعکس وصف سے اس کا علاج کیا جائے۔ مثلاً کوئی شخص بخل میں مبتلا ہو تو اسے بہ تکلف سخاوت کا عادی بنایا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام امراض کی بنیاد دو چیزیں ہیں: غضب اور جبن۔ اس لیے کوئی بھی اخلاقی مرض ہو، پہلے غضب اور جبن کا علاج کرنا چاہیے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ علاج کے پہلے طریقے کے معاملے میں حکماے یونان سے متفق ہیں۔ اس لیے اس موضوع پر تفصیل سے

اظہارِ خیال کرتے ہیں، لیکن دوسری رائے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ہر مرض کے اسباب جدا ہیں، چنانچہ وہ ہر مرض کے ذیل میں بڑی باریکی کے ساتھ اس کے مخصوص اسباب بیان کرتے ہیں، پھر اس کا علاج بتاتے ہیں۔ غیبت، غیظ و غضب اور حسد وغیرہ پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ فلسفۂ اخلاق کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہے؟ اچھائی کیوں اختیار کی جائے اور برائی سے کیوں بچا جائے؟ عموماً اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا مقصد لذائذِ جنت کا حصول اور شدائدِ جہنم سے نجات ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جنت کا حصول اور جہنم سے نجات بلاشبہ تقویٰ کا لازمی نتیجہ ہے، لیکن یہ مقصود نہیں۔ مقصودِ اصلی رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ موجودہ دور میں اخلاقی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ کسی بھی معاملے میں اخلاق کی پابندی نہیں کی جاتی۔ یہ ملک کے تمام طبقات کا حال ہے اور افرادِ امتِ مسلمہ کا بھی کوئی استثنا نہیں ہے۔ مال دار ہوں یا غریب، تجارت پیشہ ہوں یا مزدور، سیاست داں ہوں یا عوام، روایتی علما ہوں یا دانش ور سب اس کا شکار ہیں۔ ایسے میں شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ان افکار کو عام کیا جائے اور انھوں نے اخلاق کی درستی کی جو تدابیر بتائی ہیں، ان کو روبہ عمل لایا جائے۔

کیمیاے سعادت

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اہم تصنیف، اکسیرِ ہدایت ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن بعد میں خود ہی اس کا ترجمہ فارسی میں ''کیمیاے سعادت'' کے نام سے کیا۔ کیمیاے سعادت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی کی تصنیف ''احیاء العلوم الدین'' کا فارسی زبان میں ترجمہ و خلاصہ ہے۔ اس عظیم کتاب کا موضوع اخلاقیات ہے اور یہ کتاب حسبِ ذیل چار عنوانات اور چار ارکان پر مشتمل ہے۔ ہر رکن دس اصولوں پر مشتمل ہے۔[۲]

عنوانات

مضامین کے لحاظ سے عنوانات بنیادی طور پر چار ہیں: نفس کی پہچان، اللہ تعالی کی پہچان، دنیا کی پہچان، آخرت کی پہچان۔

ارکان

چار باتوں کا جان لینا اس کے ارکان ہیں۔ ہر رکن کے اندر دس دس فصلیں ہیں۔

عبادات

پہلے رکن میں عبادت کا بیان ہے۔ اس میں دس اصلیں ہیں۔ پہلی اصل اہلِ سنت کے اعتقاد پر مشتمل ہے۔ دوسری طلبِ علم پر۔ تیسری اصل میں طہارت کا بیان ہے۔ چوتھی میں نماز کا ذکر ہے۔ پانچویں میں زکوٰۃ کا بیان ہے۔ چھٹی اصل میں روزے کا بیان ہے۔ ساتویں میں حج کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ آٹھویں میں تلاوتِ قرآنِ مجید کے آداب بیان ہوئے ہیں۔ نویں اصل ذکر، دعاؤں اور وظائف پر مشتمل ہے۔ دسویں میں ترتیبِ اوراد و وظائف ہے۔

معاملات

دوسرا رکن معاملات کے آداب میں ہے۔ یہ بھی دس اصولوں پر مشتمل ہے۔ اصلِ اوّل کھانے کے آداب پر ہے۔ دوسری میں آدابِ نکاح ہیں۔ تیسری میں تجارت اور پیشے کے آداب بیان ہوئے ہیں۔ چوتھی اصل طلبِ حلال کے بیان میں ہے۔ پانچویں میں صحبت کا بیان ہے۔ چھٹی میں گوشہ نشینی کا بیان ہے۔ ساتویں اصل آدابِ سفر کے بیان میں ہے۔ آٹھویں راگ اور حال کے بیان پر ہے۔ نویں اصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے آداب کے بیان میں ہے۔ دسویں اصل رعیت پروری اور بادشاہی کے بیان پر ہے۔

مُہلِکات (ہلاک کرنے والی اشیا)

تیسرا رکن مہلکات کے بیان میں ہے۔ یہ بھی دس اصولوں پر مشتمل ہے۔ اصلِ اوّل ریاضِ تنفس کے بیان میں ہے۔ دوسری پیٹ اور شرم گاہ کی شہوت کے علاج میں ہے۔ تیسری اصل گفتگو کی حرص اور آفاتِ زبان کے بیان میں ہے۔ چوتھی اصل غصہ اور گالم گلوچ وغیرہ کے علاج میں ہے۔ پانچویں اصل محبتِ دنیا کے علاج میں ہے۔ چھٹی محبتِ مال کے علاج کے بیان میں ہے۔ ساتویں طلَبِ رتبہ و حشمت کے علاج میں ہے۔ آٹھویں اصل عبادات میں ریا و نفاق کے علاج میں ہے۔ نویں اصل تکبر اور خودستائی کے علاج کے بیان میں ہے۔ دسویں اصل غرور و غفلت کے علاج کے بیان میں ہے۔

مُنجِیات (نجات دینے والی اشیا)

چوتھا رکن منجیات کے بیان میں ہے۔ یہ بھی دس اصولوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پہلی اصل توبہ کے بیان میں ہے۔

دوسری صبر و شکر کے بیان میں۔ تیسری خوف و رجا کے بیان میں۔ چوتھی درویشی اور زہد کے بیان میں۔ پانچویں اصل نیت، اخلاص اور صدق کے بیان میں، چھٹی اصل مراقبہ و محاسبہ کے بیان میں۔ ساتویں اصل تفکر کے بیان میں۔ آٹھویں اصل توحید اور توکل کے بیان میں ہے۔ نویں محبت اور عشقِ الٰہی میں۔ دسویں موت کو یاد کرنے اور موت کے حال میں ہے۔ (۳)

اہمیت

اس کتاب کا موضوع اخلاقیات ہے اور اس کی بنیاد دین پر ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ مشکل سے مشکل بات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی سہولت سے سمجھا دیتے ہیں۔ استدلال کی غرض سے قرآنی آیات اور حدیثِ نبوی ﷺ سے کلام کو مزین کرتے ہیں۔ بعض فقرات کے آخری فعل بود، باشد، شد، گشت وغیرہ حذف کر دیتے ہیں جس سے کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی فلسفیانہ نکتے کو واضح کرنے کے لیے اس کی تشریح بھی کر دیتے ہیں لیکن تفصیل میں غیر ضروری چیزیں شامل نہیں ہونے دیتے۔

آداب الاخلاق

یہ کتاب حضور ﷺ کے اخلاقِ مبارکہ اور معجزات پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہری پاکیزگی کے حصول کے ساتھ ساتھ باطنی پاکیزگی پر زور دیا ہے۔ اور باطنی پاکیزگی کے حصول کا ذریعہ سنتِ رسول ﷺ کو قرار دیا ہے۔ (۴) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ظاہر و باطن کی کشمکش کو بہت خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ امام فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ ظاہری آداب، باطنی آداب کے عنوان ہوتے ہیں اور اعضائے ظاہری کی حرکتیں، دلی خیالات کا ثمرہ ہوا کرتی ہیں، اور ظاہری اعمال باطنی اَخلاق کے نتائج ہوتے ہیں۔ جس کا سینہ انوارِ الٰہی سے منوّر نہیں ہوتا اس کے ظاہری اعضا پر بھی اخلاق و آدابِ نبوی ﷺ کی چمک نظر نہیں آتی۔ (۵)

اس کتاب کی وجہِ تالیف بیان کرتے ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں نے کوشش کی کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ حمیدہ ذکر کر دیے جائیں جو صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیے گئے ہیں۔ لیکن اسناد کو باوجہِ طوالت ترک کر دیا گیا ہے۔ ان اخلاق کو جمع کرنے کی وجہ یہ کہ ان اخلاق کو معلوم کر کے انسان کا ایمان تازہ ہو جائے گا۔ اخلاق کے بعد

آپ ﷺ کے معجزات ذکر کروں گا۔ جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ تاکہ اخلاق کا بیان مکمل ہو جائے۔[٦] امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو بنیادی طور پر ۱۳ بیانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ذیل میں ان کو نقل کرتے ہیں:

پہلا بیان: اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو آدابِ قرآنی سے جو مؤدب فرمایا اس کا تذکرہ۔

دوسرا بیان: حضور ﷺ کے ان اخلاقِ حمیدہ کا ذکر جو علماے احادیث کی کتب سے منتخب کیے گئے ہیں۔

تیسرا بیان: حضور ﷺ کے ان اخلاق و آداب کے ذکر میں جو حضرت ابوالبختری نے روایت کیے ہیں۔

چوتھا بیان: آنحضرت ﷺ کی گفتگو اور خندہ پیشانی کا ذکر۔

پانچوں بیان: حضور ﷺ کے کھانا کھانے کے آداب کا ذکر۔

چھٹا بیان: حضور ﷺ کے آداب و اخلاق برائے لباس کا تذکرہ۔

ساتواں بیان: آنحضرت ﷺ کا قدرت کے باوجود مجرموں کے قصور معاف کرنے کا بیان۔

آٹھواں بیان: آنحضرت ﷺ کا بری باتوں کو دیکھ کر چشم پوشی کا بیان۔

نواں بیان: آنحضرت ﷺ کی جود و سخاوت کا بیان۔

دسواں بیان: آنحضرت ﷺ کی شجاعت کا بیان۔

گیارھواں بیان: آنحضرت ﷺ کی تواضع کا ذکر۔

بارھواں بیان: آنحضرت ﷺ کے حلیۂ مبارک کا بیان۔

تیرھواں بیان: آپ ﷺ کے ان معجزات کا ذکر جن سے آپ ﷺ کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔[٧]

یہ ایک عمدہ تصنیف ہے جو عشقِ رسول ﷺ اور سنت کی اتباع کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی کتب کو نصابِ تعلیم کا حصہ بنایا جائے تاکہ نئی نسل اعلیٰ اخلاق سے مزّین ہو سکے۔

جاری ہے

حواشی

۱)غزالی، ابو حامد، احیاء العلوم، بیروت، ج:۳، ص ۳۹-۴۰

۲)غزالی، ابو حامد، کیمیائے سعادت، اردو ترجمہ: محمد سعید نقشبندی، مطبوعہ ۱۹۹۹، پروگریسو بکس، لاہور، ص:۳۶، ۳۵

۳)ایضاً

۴)یہاں یہ بات واضح رہے کہ باطنی پاکیزگی سے مراد وہ نہیں جو باطنیہ فرقہ کے لوگ لیتے تھے بلکہ اس سے مراد قلب کی صفائی اور روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔

۵)غزالی، ابو حامد محمد، آداب الاخلاق، اردو ترجمہ بحوالہ مجموعہ رسائل امام غزالی، مطبوعہ ۲۰۰۴، دارالاشاعت، کراچی، ج:۱، ص ۴۶۹

۶)ایضاً، ص:۴۷۰

۷)غزالی، ابو حامد محمد، آداب الاخلاق، اردو ترجمہ بحوالہ مجموعہ رسائل امام غزالی، مطبوعہ ۲۰۰۴، دارالاشاعت، کراچی، ج:۱، ص:۴۶۹

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

منکرینِ حدیث

سوال: ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ منکرِ حدیث کے بارے میں قرآن وسنت میں کیا حکم ہے؟ یعنی جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن ہی اصل ہے اور حدیث تو صرف ایک میک اپ قسم کی چیز ہے تم نے خوامخواہ ہی اسے اتنا اٹھایا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں رہنمائی فرمائیں۔

جواب: رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال میں سے کئی روایات متواتر اور خبر مشہور کے درجے میں بھی ہیں۔ منکرینِ حدیث بلاتفریق ہر ایک کا انکار کرتے ہیں۔ چناں چہ انکارِ حدیث سے نہ صرف متواتر روایات کا انکار لازم آتا ہے بلکہ اس سے قرآن کا بھی انکار لازم آتا ہے، قرآن مجید میں اللہ جل شانہ نے کئی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے۔ اس وجہ سے منکرینِ حدیث باتفاقِ علماے اہلِ سنت؛ دینِ اسلام سے خارج ہیں۔ منکرینِ حدیث کے سَرخَیل غلام احمد پرویز کے بارے میں انکارِ حدیث کی بنا پر علماے کرام نے ایک متفقہ فتویٰ موسوم 'غلام احمد پرویز کے بارے میں علما کا متفقہ فتویٰ' بھی شائع فرمایا تھا۔ جس میں انکارِ حدیث سمیت اس شخص کے مختلف نظریات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر بآسانی دستیاب ہے۔ تفصیل کے لیے اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ البتہ یہ واضح رہنا چاہیے کہ ایک ہے عمومی حکم کہ جو حدیث کا علی الاطلاق انکار کرے تو وہ کافر ہے، مگر کسی متعیّن فرد کے بارے میں فیصلہ کہ آیا وہ منکرِ حدیث ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا اس درجے کا کہ اُس کی تکفیر بھی لازم آتی ہے یا نہیں، یہ ایک اجتہادی امر ہے جو اکابر علما و مفتیان ہی کا کام ہے۔ کسی عام آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ حکم لگائے۔ متعیّن فرد کا حکم علما سے معلوم کرنا چاہیے۔

*****

سلیمؔ احمد (۱۹۲۷ـ۱۹۸۳ء)
معروف نقاد

نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار (۱)

سب سے پہلے میں اکادمی ادبیات پاکستان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے ایک ایسے اہم اجتماع میں، جس میں ملک کی مقتدر ترین سیاسی، علمی، ادبی اور تہذیبی شخصیتیں موجود ہیں، ایک اتنے ہی مہتمم بالشان موضوع پر مجھے اپنے ناچیز خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ اس سے مجھے جو مسرت ہوئی اس کو ظاہر کرنے میں بخل سے کام لیے بغیر مجھے اعتراف ہے کہ جب مجھے اکادمی کا دعوت نامہ ملا تو اسے قبول کرنے میں جھجک اور تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے موضوع کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا علم تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو موضوع مجھے تفویض کیا گیا ہے وہ طرح طرح کے اختلافات کو آوازیں دیتا ہے اور اس پر بات کرنا خود کو تنازعات کی بجلیوں کی زد میں کھلا چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔

شاید میں اس تذبذب سے باہر نہ نکل سکتا، اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ ہر انسان کی سچائی اس کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے اور لکھنے والا اگر اپنی صداقت کے ساتھ ہے تو پھر اسے کسی چیز سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ سے جو باتیں کہوں گا، وہ صرف وہی باتیں ہوں گی جو میرے ضمیر میں زندہ ہیں اور جن کو میں نے اپنے محدود تجربے اور اس سے بھی زیادہ محدود تر علم میں درست پایا ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف پیش قدمی کرتا ہوں۔

ہمارا موضوع نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار ہے۔ معاف کیجیے، اس سلسلے میں جو پہلی بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنی مجرد صورت میں مجھے اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دراصل مجھے جس سوال سے دلچسپی ہے وہ میرے ذہن میں

ایک اور طرح آتا ہے۔ فرض کیجیے، میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ایک نظریاتی ریاست کا شہری ہوں اور ازراہِ عنایت آپ بھی یہ تسلیم کر لیں کہ میں ایک ادیب ہوں تو میرا سوال یہ ہو گا کہ مجھے جس نظریاتی ریاست کی شہریت کا شرَف حاصل ہے، اس میں میرا کردار کیا ہو گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ میرے نزدیک ہر سچا خیال ایک شخصی اعتراف ہوتا ہے۔ ہم جو کچھ سوچتے ہیں، اگر وہ واقعی سوچنا ہے تو ہمارے تجربات کا حاصل ہوتا ہے، جس میں ہمارے محسوسات، جذبات، یہاں تک کہ تعصبات اور ترجیحات سب شامل ہوتے ہیں۔ ہم اپنے تجربات کو مربوط اور منظم کر کے یا ان کی تعمیر کے ذریعے ایک پورا نظامِ خیال مرتب کر سکتے ہیں مگر وہ ہمارے تجربے سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے۔ ورنہ بہ صورتِ دیگر وہ سوچنے کے نام پر نہ سوچنے کا عمل ہو گا۔

اب یہ سوال کہ ایک مخصوص نظریاتی ریاست میں میرا کردار کیا ہو گا، مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ میرا اپنا نظریہ کیا ہے اور وہ ریاست کے نظریے سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ فرض کیجیے اس کا جواب نفی میں ہے۔ میرا نظریہ کچھ اور ہے، ریاست کا نظریہ کچھ اور ہے۔ اس صورت میں مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ میں ریاست کا وفادار ہوں یا اپنے نظریے کا۔ اب اگر میں ریاست کی وفاداری میں اپنے نظریے سے دست بردار ہو جاؤں تو میرے لیے یہ امن وعافیت کا راستہ ہو گا لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ادیب ہونے کی حیثیت بھی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اپنے نظریے یا بہ الفاظِ دیگر اپنے تجربے سے غداری کر کے میں ادیب نہیں رہ سکوں گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میں اپنے نظریے سے وفاداری پر قائم رہوں۔ اس صورت میں مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ریاست سے میرا تعلق کیا ہو گا؟ میرا خیال ہے کہ ایمان داری اور سچائی کا راستہ یہ ہے کہ میں ادب کے ساتھ اس ریاست کی شہریت اسے واپس کر دوں اور جہاں سینگ سمائیں نکل جاؤں۔ یقیناً یہ میرے لیے زیادہ عزت کا راستہ ہو گا کہ میں ریاست کے اندر رہتے ہوئے اس کے قانون کے تحت وہ مراعات حاصل کرتے ہوئے جو اس کے وفادار شہریوں کا حق ہیں، ریاست کے خلاف سازشیں کروں یا اس کے دشمنوں کا آلہ کار بن جاؤں اور اس ریاست میں انتشار اور افتراق کی آگ بھڑکانے کی کوشش کروں، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ایک سچے ادیب کی زندگی بسر کرنے کی بجائے ایک بزدل اور سازشی کی زندگی بسر کر رہا ہوں جو انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک قابلِ مذمت اور سیاسی اور قانونی نقطۂ نظر سے ایک قابلِ تعزیر زندگی ہے۔

یہ صورت اس وقت پیدا ہوگی جب ریاست کے نظریے اور میرے نظریے میں اختلاف ہو۔ دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ میرے اور ریاست کے نظریے میں مطابقت اور ہم آہنگی ہو۔ میرے خیال میں یہی وہ صورتِ حال ہے جو ہمارے موضوع کا صحیح تعین کرتی ہے اور زیادہ صاف لفظوں میں مجھے یہ کہنا چاہیے کہ یہ سوال خلا میں نہیں اٹھایا گیا ہے، اس کے پیچھے حقیقت کی ٹھوس زمین موجود ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے نزدیک پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس لیے بعض لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار کیا ہوگا؟ جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا، میں اس کا ایک شخصی جواب ہی دے سکتا ہوں، مجھے قطعی طور پر یہ اصرار نہیں ہوگا کہ دوسرے بھی اسے تسلیم کریں۔ لیکن میں اپنے شخصی جواب کو عقل اور فہم کی عدالت میں اس طرح پیش کروں گا کہ جو لوگ میرے استدلال سے متاثر ہو کر میرے خیال میں شریک ہونا چاہیں، انھیں میری طرف سے ہر ممکنہ سہولت فراہم کی جائے۔

آپ مجھے معاف کریں۔ مجھے اس بات سے اختلاف ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس بات پر اگر آپ چونک پڑیں تو مجھے حیرت نہیں ہوگی لیکن میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میری پوری بات سننے سے پہلے آپ برہم نہ ہوں۔ میں جانتا ہوں جو خیالات فیشن بن جاتے ہیں ان کے خلاف کوئی بات کہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یقین کیجیے کہ ہماری عافیت فیشن کی پیروی میں نہیں، سچائی کی مطابقت میں ہے۔ نظریاتی ریاست ایک جدید اصطلاح ہے جو اشتراکی ریاستوں کے قیام کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ اشتراکی ریاستیں بورژوا ریاستوں کے مقابلے پر جو عوام کی اکثریت کے فیصلے کے سوا اور کسی اصول کی تابع نہیں ہیں، اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ وہ ایک مربوط اور منظم طریقے کی تابع ہیں۔ اب کچھ لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ پاکستان اسلام کو اپنی بنیاد تسلیم کرتا ہے، نیک نیتی لیکن سادہ دلی سے پاکستان کو نظریاتی ریاست قرار دیا ہے۔

مجھے اس بات پر بنیادی اعتراض یہ ہے کہ اسلام ایک دین ہے، نظریہ نہیں ہے۔ دین خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے جب کہ نظریے انسانی دماغوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ پاکستان اگر اسلام کو تسلیم کرتا ہے تو پاکستان ایک دینی ریاست ہے، نظریاتی ریاست نہیں۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ لفظی اختلاف ہے۔ نظریے اور دین میں بہت سی ایسی مماثلیں موجود ہیں کہ ایک کی بجائے دوسرا لفظ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس خیال کے پیچھے مجھے کچھ لوگوں کا یہ اضطراب بھی جھانکتا نظر آتا ہے کہ ذہنِ عالم کی

موجودہ فضا میں ''دینی ریاست'' کا لفظ استعمال کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ دین کا لفظ لوگوں کو چونکاتا ہے جب کہ نظریے کا لفظ وہ آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نظریے کا لفظ استعمال کر کے اس سے اسلام مراد لی جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔ مطلب تو آم کھانے سے ہے، آم کو املی کہہ دیا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اس استدلال کے زور کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود اپنی بات پر قائم رہنا چاہتا ہوں۔

ہمارا زمانہ فتنۂ الفاظ کا زمانہ ہے۔ ہم لفظ کو ایک بے وقعت چیز سمجھ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلتا ہے کہ لفظ کے ساتھ حقیقت بھی بدل جاتی ہے۔ آم کو املی کہتے کہتے ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہمیں املی ہی کھانی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا دین کو دین کہنے سے شرمانا کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے اختیار کرنا لازمی سمجھ لیا جائے۔ اس کے علاوہ جب میں پاکستان کو ایک دینی ریاست کہتا ہوں تو اس کا ایک اور مقصد بھی ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک طرف تو اسے اشتراکی ریاستوں سے بالکل الگ کر دیا جائے اور دوسری طرف ان ریاستوں سے جو نام نہاد طور پر غیر نظریاتی ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ غیر نظریاتی ریاستیں وہ ہیں جنہیں اشتراکی بورژوا جمہوری ریاستیں کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان ریاستوں کے وجود میں آنے سے پہلے یورپ ایک طویل و عریض مسیحی ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ بورژوا جمہوری ریاستیں مذہب کے خلاف ایک مسلسل اور بتدریج بغاوت کا نتیجہ ہیں۔ یہی بغاوت تھی جس نے ایک تاریخی عمل کے ذریعے یہ تصور پیدا کیا کہ دین کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور دین ہر فرد کا ایک شخصی معاملہ ہے۔ اس تصور کے ذریعے پہلے ریاست کو دین کی بالادستی سے آزاد کرایا گیا اور پھر افراد کی شخصی زندگی میں بھی دین کا جو حشر ہونا تھا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم غیر نظریاتی ریاستوں کو لادینی ریاستیں کہہ سکتے ہیں۔

اب پاکستان ان لادینی ریاستوں سے اس وجہ سے مختلف ہے کہ وہ دین اور سیاست کی دوئی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور ریاست کو دین کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ اشتراکی ریاستوں سے اس بنا پر الگ ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے کسی ایک رخے، ناقص اور محدود زمانی اور مکانی تناظر میں تشکیل پانے والے نظریے کا نہیں بلکہ دین کا پابند ہے۔ اب غالباً وقت آگیا ہے کہ میں دین اور نظریے کے فرق کو ممکنہ وضاحت سے بیان کر دوں۔ دین؛ اگر ہم اس کے عناصرِ ترکیبی کا تجزیہ کریں تو چار چیزوں کا

مجموعہ ہوتا ہے:

(۱)عقائد (۲)عبادات (۳)اخلاقیات (۴)ایمان

نظریے کا لفظ ان چاروں عناصر میں سے کسی ایک کا بھی پوری طرح احاطہ نہیں کرتا اور اگر کھینچ تان کر اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے تو بڑے مضحک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ اشتراکی نظریے میں جدلیاتی مادیت کی فلسفیانہ اساس عقائد کے مترادف ہے۔ جبکہ معاشی نظام اور اس سے متعلقہ احکام اخلاقیات کے مساوی ہیں۔ شاید کوئی منچلا یہ بھی کہہ دے کہ یومِ مئی اور یوتھ فیسٹیول جیسی چیزوں کو عبادت کا درجہ حاصل ہے اور اشتراکی جس جوش اور جذبے سے کام کرتے ہیں اسے ایمان کہا جاسکتا ہے۔ اس طرزِ استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو اشتراکیت تو بڑی چیز ہے، ہاکی کے کھیل کو بھی پورا دین و ایمان ثابت کیا جاسکتا ہے۔ دراصل دین اور نظریے میں چار بنیادی فرق ہوتے ہیں جن کی وجہ سے دین کو نظریہ نہیں کہا جاسکتا۔

(۱) دین خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے جب کہ نظریے انسانوں کے ساختہ ہوتے ہیں۔

(۲) دین دائمی ہوتا ہے جبکہ نظریے ہر انسانی چیز کی طرح آنی فانی ہوتے ہیں۔

(۳) دین کا مرکز خدا ہوتا ہے جب کہ نظریے ہمیشہ انسانوں کو مرکز بناتے ہیں۔

(۴) دین حیاتِ دنیوی کے ساتھ حیاتِ اخروی سے بھی وابستہ ہوتا ہے جب کہ نظریے صرف حیاتِ دنیوی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جاری ہے

*****

ماہر القادری (۱۹۰۷ـ۱۹۷۸ء)
معروف شاعر

قرآن کی فریاد

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں، آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں، دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں

جزدان حریر و ریشم کے، اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے، خوشبو میں بسایا جاتا ہوں

جس طرح سے طوطے مینا کو، کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں، اس طرح سکھایا جاتا ہوں

جب قول و قسم لینے کے لیے، تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے، ہاتھوں پہ اُٹھایا جاتا ہوں

دل سوز سے خالی رہتے ہیں، آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اِک اِک جلسے میں، پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں

نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے، سچائی سے بڑھ کر دھوکا ہے
اک بار ہنسایا جاتا ہوں، سو بار رُلایا جاتا ہوں

یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں

کس بزم میں مجھ کو بار نہیں، کس عُرس میں میری دُھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں، مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

*****